پے درپے سفر

〈افسانوی مجموعہ〉

مترجم:

مدثر رشید

پے در پے سفر

〈افسانوی مجموعہ〉

مترجم:

مُدثّر رشید

ISBN: 978-93-5346-835-4

نام کتاب : پے درپے سفر (افسانوی مجموعہ)

مترجم : مُدثّر رشید

مرتب: : پروفیسر محمد جمیل

سالِ اشاعت : ۲۰۱۸

تعداد : ۵۰۰

قیمت: : Rs 350/-

کمپیوٹر کتابت : سخی شاہ عرفان

طباعت : المختار پبلی کیشنز (اسلام آباد) اننت ناگ کشمیر

کتاب ملنے کا پتہ

۱۔ المختار پبلی کیشنز۔نئی بستی اننت ناگ (اسلام آباد) کشمیر۔۱۹۲۱۰۱

۲۔ مُدثرِ رشید فیروز: ہاکورہ اننت ناگ کشمیر۔۱۹۲۲۱۱

۳۔ شعبۂ اردو، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، پنجاب۔۱۴۷۰۰۲

Mudassir Rashid
Mobile: 9796715300
e mail: mferoz41@gmail.com

اے والئ کشمیر!

تمہارے نام....

کہ ان تحریروں میں

تمہارے درد کی تپش ہے!!!

کسی بھی احساس کو

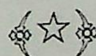
کوئی بھی زبان عطا کی جائے

دل سے اگر سنی جائے

تو لفظ لفظ نس نس میں اپنا اثر کر جاتا ہے

احساس زبان کا محتاج ہو ہی نہیں سکتا

فہرست



پیش لفظ

مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ مدثر رشید نے چنندہ کشمیری کہانیوں کا ترجمہ کر کے انھیں کتابی صورت میں 'پے در پے سفر' کے عنوان سے شائع کرنے کا عزم کیا ہے۔ اس کا یہ کام اردو اور کشمیری دونوں زبانوں کے لیے منفعت بخش رہے گا۔ اردو میں جہاں تراجم کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی ہے وہیں کشمیری ادب کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے سے اس کا دائرہ وسیع تر ہونے کی امید ہے۔

کشمیری زبان میں بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے افسانے لکھے گئے حالانکہ لوک کتھاؤں اور داستانوں کا چلن اس دھرتی پر قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا۔ روایتاً داستان گو مخصوص مجلسوں میں

داستانیں ایک سلسلہ کے طور پر سنایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہتا تھا۔ بعض اوقات ان داستانوں کو موسیقی اور گیتوں سے بھی مزیّن کیا جاتا تھا۔ قصے سن کر سامعین محظوظ ہوتے اور ان قصوں میں ملفوف نصیحتوں سے وہ مستفید بھی ہوتے۔ البتہ جب ہم صنف افسانہ کی بات کرتے ہیں تو ہمارا ذہن انگریزی زبان سے مستعار لی گئی اس صنف کی جانب مبذول ہو جاتا ہے جس کو شارٹ سٹوری یا مختصر افسانہ کے نام سے جانا جاتا ہے اور جو اردو لٹریچر میں انیسویں صدی کے اواخر میں اور اس کے تین چار دہائیوں بعد کشمیری ادب میں وارد ہوئی۔

کشمیر میں چونکہ ڈوگرہ حکومت کے دوران اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا، انجام کار یہاں کے طالب علم اردو سے مانوس ہوتے رہے اور انھوں نے آگے جا کر اسی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنا لیا۔ وادی میں بے شمار اردو اخبار شائع ہوتے رہے اور کئی قلم کاروں نے اردو میں یا تو شاعری کی یا پھر نثر (فکشن، تنقید و تاریخ) کی طرف راغب ہو گئے۔ بہ ایں ہمہ ابتدا ہی سے کشمیری ادیبوں کے سامنے ایک مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ وہ تھا اردو دنیا میں اپنے تشخص کو قائم کرنے کا۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اردو کے ناقدین نے جہاں ایک طرف ان کشمیری قلم کاروں کی خوب پذیرائی کی جو کشمیر سے باہر لکھنؤ، دلّی یا لاہور میں مقیم تھے

جیسے دیا شنکر نسیم ، برج نرائن چکبست ، برج موہن دتا تریہ کیفی ، کشن پرشاد کول ، پنڈت بدری ناتھ سدرشن ، آغا حشر کاشمیری ، علامہ اقبال ، سعادت حسن منٹو ، پریم ناتھ در ، کشمیری لال ذاکر وغیرہ مگر دوسری طرف ان قلم کاروں کو فراموش کیا گیا جو کشمیر میں مستقل طور پر رہ رہے تھے جیسے پریم ناتھ پردیسی ، حکیم منظور ، پشکر ناتھ ، حامدی کشمیری ، ویریندر پٹواری ، نورشاہ ، سوم ناتھ زتشی ، بنسی نردوش ، رفیق راز وغیرہ۔ اس کے بنیادی اسباب یہ ہیں کہ اردو کشمیری ادیبوں کی مادری زبان نہیں ہے۔ یہاں کے ادیب عموماً کشمیر کی وادی کے مسئلہ جات کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے باعث ان کا کینوس محدود رہتا ہے اور یہاں کے تنقید نگار کشمیر نژاد ادیبوں کی پذیرائی کرنے سے کتراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری ادیب لکھنا تو اردو میں شروع کرتے ہیں لیکن دھیرے دھیرے اپنی مادری زبان کی جانب مائل ہو جاتے ہیں جب کہ چند ایک جیسے رامانند ساگر فلموں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس باہری قلم کاروں مثلاً کرشن چندر نے کشمیر سے متعلق سینکڑوں افسانے لکھے جن میں یہاں کی قدرتی خوبصورتی (پہاڑوں ، مرغزاروں ، چراگاہوں ، جھرنوں ، چنار اور دیودار کے پیڑوں) کی منظر کشی کی گئی یا پھر یہاں کی دلفریب دوشیزاؤں کے حسن و

اداؤں کی تعریفوں کے پُل باندھے گئے۔ غرض یہ کہ انھوں نے قارئین کے ذہن پر کشمیر کو بطور رومانس کی آماج گاہ کا تصور ثبت کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ کرشن چندر کی مقبولیت میں خیالی رومانی کشمیر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن مقامی ادیبوں کے لیے یہ سب کچھ لکھ پانا ناممکن تھا کیونکہ وہ یہ زندگی خود بھوگ رہے تھے اور اس کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ وہ گلمرگ کے آرام دہ ہوٹل میں بیٹھ کر کشمیر کے تصوراتی حسن کی پیکر تراشی نہیں کر رہے تھے۔ مقامی ادیب چھ مہینے وادی کے اندھیروں میں زندگی تلاشتے ہیں، ہر لمحے انفراسٹرکچر کی نایابی سے جوجھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے صرف بہار کا گلشن زار نہیں ہوتا بلکہ موسم خزاں اور موسم سرما کی ویرانیاں بھی ہوتی ہیں۔ انھیں کشمیریوں کی غربت، زبوں حالی اور کرب کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس حسن کو پامال ہوتے دیکھتے ہیں جو باہری رائٹرس کی نگارشات کا جوہر بن جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں وہ یونانی تان سین آرفیس کی طرح لوگوں کو مسحور کرنے کے لیے بربط پر اپنی انگلیاں کیسے پھیر سکتا ہے۔

مذکورہ تناظر میں دیکھا جائے تو مدثر رشید نے ایک بہت ہی اہم اور دانشمندانہ قدم اٹھایا ہے۔ اس نے کشمیری زبان میں لکھی گئی کئی نمائندہ کہانیوں کا عرق ریزی سے اردو ترجمہ کیا ہے اور اب ان کو کتابی صورت

میں پیش کر رہا ہے تا کہ اردو قارئین ان سے آگاہ اور مستفید ہوسکیں۔ مدثر رشید نے کتاب کا ٹائیٹل 'پے در پے سفر' رکھا ہے جس عنوان سے کتاب میں ایک افسانہ بھی شامل ہے۔ مجموعے میں کُل ۱۲/افسانے شامل ہیں جو کشمیری زبان کے جید افسانہ نگاروں کی تخلیقات ہیں۔ اس سے پہلے کشمیری افسانے سے متعلق تعارفی باب ''دو باتیں کشمیری افسانے کی'' میں ترجمہ نگار نے کشمیری افسانے کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق جانکاری دی ہے اور مختلف ادوار کے نمایاں افسانہ نگاروں کی اہم تصانیف کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مرتب کو جدیدیت نے خاصا متاثر کیا ہے، اس لیے مجموعے میں مشمول اکثر و بیشتر افسانے علامتی اور تجریدی انداز کے ہیں۔ علاوہ ازیں ان افسانوں میں ایک زیریں لہر بھی نظر آتی ہے جو کشمیر اور کشمیریوں کے کرب سے تعلق رکھتی ہے۔

مجموعے کا پہلا افسانہ ''خوف'' ہے جو اختر محی الدین نے قلم بند کیاہ۔ افسانے میں چوزے کی موت کو استعارہ بنایا گیا ہے۔ اس میں ایک نہتے، بدقسمت، بے یار و مددگار اور لاچار چوزے کی جہد زندگی کی عکاسی کی گئی ہے کہ وہ کس طرح باز، انسان اور مرغانِ ہم کفو کی غارت گری کا شکار ہوتا ہے۔ اختر محی الدین کا ہی ایک اور افسانہ ''کبھی دھوپ

کبھی چھاؤں'' ہے جس میں کافی ہاؤس میں بیٹھے لوگ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور انسان کی تنہائی اور اکیلے پن پر بحث کرتے ہیں ۔ اوتار کرشن رہبر کی کہانی ''دھری دو آنکھیں' 'بصری احساس وادراک پر فوکس کرتی ہے کہ آنکھیں زندگی کی تصویر کشی کرتی ہیں، وہ جو ہم دیکھتے ہیں حقیقت ہے اور جو نہیں دیکھ پاتے وہ لایعنی ''چکور'' ہردے کول بھارتی کا افسانہ ہے جس میں عاشق کی نیت پر سوال اٹھتا ہے۔ یہ طے نہیں ہو پاتا کہ چکور چاند سے سچ مچ جنونی عشق میں مبتلا ہے یا پھر اسے کھانے کی تمنا رکھتا ہے ۔ یہ دُبدھا انسانی فطرت کو آئینہ دکھاتی ہے کہ عشق افلاطونی ہوتا ہے یا شہوانی۔ ہردے کول بھارتی کا ایک اور افسانہ ''ہمزاد' ' ہے جس میں کبوتر اور بس کو بطور علامت پیش کیا گیا ہے ۔افراتفری اور پولیس ایکشن کے درمیان امن وحفاظت کی تلاش میں سرگرداں انسان اس کا مرکزی کردار ہے ۔علی محمد لون کے رقم کیے ہوئے افسانے ''خلاء'' میں انسانی زندگی کی لایعنیت اور بے معنویت کو منعکس کیا گیا ہے جس میں آسودگی کے باوجود انسان کو ہمیشہ کچھ کمی، کچھ ناچاری، اور کچھ ادھورے پن کا احساس رہتا ہے اور اس خلا کو وہ کبھی پُر نہیں کر پاتا۔ ہری کرشن کول کی کہانی ''شمشان ویراگ' 'ایک کھلنڈرے اور خوش گزراں انسان کی کہانی ہے جو اپنے دوست کی ماں کو

اگنی میں جلتے دیکھ کر اشک بار ہوتا ہے کیونکہ اس کو اپنی کھوئی ہوئی ماں یاد آتی ہے۔ حقیقت سے قریب سماجی کہانی ''پھاٹک'' امین کامل نے قلم بند کی ہے جس کا اسلوب دوسری کہانیوں سے کچھ ہٹ کر ہے۔ کہانی میں پولیس کے جبر وستم اور خانہ پُری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ رتن لال شانت کا افسانہ ''پہلا سبق'' ایسی دنیا کی سیر کراتا ہے جس میں غربت اور ناخواندگی ہے، جہاں نہ معلم ملتے ہیں اور نہ ڈاکٹر، تاہم مرکزی کردار ہمت نہیں ہارتا اور بچوں کو دنیا کی ہئیت کے بارے میں پہلا سبق پڑھاتا ہے۔ افسانہ ''پے در پے سفر''، جو اس مجموعے کا ٹائیٹل بھی ہے، شمس الدین شمیم کا لکھا ہوا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک بچہ انسان کی زندگی کے مراحل اور ان سے جڑی صعوبتوں سے خوفزدہ ہو کر چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ بچہ ہی بنا رہے جو ممکن نہیں ہے۔ انیس ہمدانی کی کہانی ''ریڈیو اعلان کے بعد'' میں ہر کسی کو، جو یہ خبر سنتا ہے، عفریت کا انتظار رہتا ہے گو زندگی بدستور دوسرے دنوں کی مانند چلتی رہتی ہے۔ ایسی ہی ایک کہانی ''دی گھوسٹ'' کے عنوان سے میں نے بہت پہلے پڑھی تھی جس میں ریل گاڑی میں سفر کر رہا آدمی خود گھوسٹ سے ہمکلام ہوتا ہے اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اسے گھوسٹ پر یقین نہیں ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے سامنے بیٹھا آدمی غائب ہو جاتا ہے۔ مدثر رشید کا افسانہ ''رنگ

راول''، میں انسانی نفسیات کو اجاگر کیا گیا ہے کہ ہم بلا وجہ افواہوں پر یقین کر کے جذبات میں بہہ جاتے ہیں اور جو لوگ ہماری بھلائی چاہتے ہیں ان ہی کا قلع قمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

مشمول افسانوں پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مجموعے میں جتنے بھی افسانے ہیں ان کی آفاقیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ انسانی سرشت اور انسانی نفسیات کو کھنگالتے ہیں ان کہانیوں کا اردو میں ترجمہ ہو کر منظر عام پر آنے سے اردو قارئین کو کشمیری ادب میں جھانکنے کا موقع مل سکے گا۔ مدثر رشید کی یہ کوشش کتنی کامیاب رہے گی یہ تو قارئین کے ریسپانس ہی سے پتا چلے گا۔ البتہ مجھے پوری امید ہے کہ اردو کے قارئین اس کتاب کا خیر مقدم کریں گے۔ اس کتاب کی مقبولیت کے لیے میں دعا گو ہوں۔

وسُندھرا، غازی آباد　　　　　　دیپک بُدکی

سرنامہ

.....یہ بات سچ ہے کہ انسان کے احساسات، جذبات، کیفیات اس کی اپنی مادری زبان میں بہتر طور پر ادا ہوتے ہیں کہ لاشعوری یا شعوری طور پر انہیں اظہار کے پیرائے میں ڈھانے کے لیے لفظوں کو باہمی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی کیونکہ اگر ایک جانب حادثات و وارداتِ قلب، تخیل کا نازک خیال اور جذبوں کا ایک لمبا چوڑا کارواں تخلیق کار کی لاشعوری شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے وہیں اس کا لفظی اظہار تخلیق کار کی اپنی مادری زبان میں بہتر طور پر صفحہ قرطاس پر بڑے خوبصورت دل پزیر اور پُر اثر انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان تخلیقات میں نہ صرف اس زبان کی انفرادیت اظہر من

الشمس ہو جاتی ہے بلکہ اس کی محاوراتی، علامتی، فوک لور اور علاقائی خوشبو کا احساس بھی قاری کو اپنے جاودانی اور انفرادی طلسم کا اسیر بنا دیتا ہے اور یہی ہر مقامی زبان کی علاقائی کہانیوں یا تخلیقی شہہ پاروں کی خاصیت ہے۔

.... یہ بات بھی اپنی جگہ سچ ہے کہ کئی ایسے فن پارے بھی ادبی تاریخ کی زینت بن چکے ہیں، بن رہے ہیں یا بن پائینگے۔ جو تخلیق کاروں نے اپنی مادری زبان میں نہیں لکھے ہیں لیکن جب معاملہ ایک علاقائی، مقامی یا مخصوص تہذیب وتمدن سے تعلق رکھنے والی تخلیقات کا ہوتو ان کے لیے اسی رنگ کی، اسی احساس کی ترجمان زبان کا محاوراتی، علامتی اور استعاری سہارا لازمی ہے جس کے طفیل اس تخلیق کا موضوع بھی اطمینان کی سانس لیتا ہے اور اس کا ظاہری پیکر بھی اپنے مقامی حسن کی دلفریب مثال بن کر جلوہ گر ہوتا ہے۔

..... اب ایسے میں ان شہہ پاروں کا کسی اور زبان میں ترجمہ کرنا.... نہ صرف کارے دار دوالا معاملہ ہے بلکہ ایک جرأت مندانہ اقدام بھی.... یہ خدشہ لاحق تو رہتا ہی ہے کہ کہیں تخلیق کا بے مثال اور حسین چہرا مسخ نہ ہو۔ کہیں دوسری زبان کے رنگ میں ڈھلتے

ڈھلتے اس کا اپنا رنگ پھیکا نہ پڑ جائے۔ کہیں اس کے محاورے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے کرتے اپنی تہذیب کے کارواں سے بچھڑ نہ جائیں۔ کہیں ان کہانیوں میں شامل مقامی کردار دوسری زبان بولتے بولتے اجنبی شہر کی اجنبی راہوں میں گُم نہ ہو جائیں۔ اور سب سے اہم یہ کہ کہیں ترجمہ اصل تخلیق کے معیار سے یوں نہ گر جائے کہ اپنے ساتھ اصل کو بھی لے ڈوبے....

.... شُکر قلم بخشنے والے خالقِ قلم کا کہ اس کتاب میں مدثر رشید فن کی نہایت ہی تنگ، دشوار گذار راہوں سے گزرتے ہوئے مشقت طلب لمحات کی کیفیات سے سرخروئی کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہوئے ایک اچھے ترجمے سے لبریز کچھ کشمیری کہانیوں کے خوشبو دار احساس کے ساتھ قاری اور ناقد کے روبرو آئے ہیں اور خاموش خاموش سرگوشیوں میں اس بات کا احساس دلا رہے ہیں کہ انہیں کشمیری کرداروں، کشمیری ماحول، کشمیری تہذیب، کشمیری تمدن، کشمیری حسن، کشمیر کی بے مثال کشمیریت اور کشمیری زبان کی نازک ترین باریکیوں کا علم ہے اور اسی علم کی روشنی میں وہ قدم قدم ایک اور میٹھی، خوبصورت اور دل کو چھونے والی زبان اردو کے دیوانِ خاص

میں داخل ہوکر عالمِ تخیل میں اپنے رہبرانِ فن کے سامنے دوزانو ہوکران تراجم کی نقش ونگاری اور کندن گری انجام دے چکے ہیں۔

.... اردو ادب کا خزانہ جہاں اپنی جگہ پر بے شمار ہیروں سے چمک رہا ہے وہیں کشمیری ادب کے خزانے سے چنندہ یہ چند نگینے بھی اردو کے قاری کو کشمیری ادب کی وسعتوں کا اور پتہ دینگے اور یوں مترجم کا حق ادا ہوجائے گا۔

.... ناقد اس میں نکتے تلاش کریں لیکن یہ نکتہ اپنی جگہ روشن، حسین اور مہکتا ہو، تاکہ یہ تراجم قابلِ قبول ہونے کی سند ضرور حاصل کریں۔

.... یہی میری تمنا بھی ہے اور یہی میری دعا بھی۔

زاہد مختار

مدیر ماہنامہ ”**لفظ لفظ**“

اسلام آباد کشمیر

استقبالیہ

عزیزم مدثّر رشید کے ذریعے رنگہائے رنگ کا افسانوی مجموعہ کشمیری زبان سے اردو زبان میں منتقل کرنا نقلِ مکان سے کم نہیں۔ زبان و بیان کومن وعن قائم رکھنا، افسانوی ادب میں نشیب و فراز کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے صحیح ترجمہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ سلاست وتسلسل افسانہ کی حلاوت ہے۔ اس شیرینی کی وجہ سے قاری افسانہ کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ ترجمہ نگار اس میں روح ڈال کر حیاتِ جاوداں میں داخل کرتا ہے۔ درحقیقت یہی کام عزیزی مدثّر رشید نے کر دکھانے کی سعی کی ہے۔ مختلف مصنّفین کے افسانوں کو اردو جامہ پہنا کر قارئین کی روح پروری کے لیے گلدستہ نما افسانوی مجموعہ پیش کیا ہے۔ دراصل کشمیر جاننا کوئی مشکل نہیں لیکن مدثّر رشید نے ان افسانوں میں پورا کشمیر پیش کر کے قارئین کے لیے مسائل کشمیر اور سرزمین کشمیر جاننے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔

مجموعے میں شامل 'خوف' افسانہ میں ایک بے زبان جوجہ کی کسمپرسی کا ذکر کیا ہے۔ ''دھری دو آنکھیں'' میں بے چارگی، بے بسی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''چکور'' پرندہ کو علامت بنا کر افسانہ میں وقت کی رفتار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ''کبھی دھوپ کبھی چھاؤں'' میں زمانہ کے نشیب وفراز کی منظر کشی کی گئی ہے۔ زندگی کے ساتھ جڑے امورِ خانہ داری، ملازمت اور کارہائے زندگی کو 'خلاء' میں پیش کیا ہے۔ ''شمشان ویراگ'' میں اشاروں کنایوں میں کچھ کر گذرنے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ''پھاٹک، ہمزاد، پہلا سبق، رنگ راول'' افسانے حالاتِ حاضرہ کے عکاس ہیں۔ ان تمام افسانوں میں زندگی سے جڑی جملہ ضروریات وابستہ ہیں۔

المختصر یہ افسانوی مجموعہ کشمیر کے حالات، جذبات اور واقعات کا مجموعہ ہے۔ دعا گوہوں کہ اللہ تعالیٰ عزیزی مدثّر رشید کے زورِ قلم میں اوراضافہ کرے۔ آمین

پروفیسر محمد جمیل

صدرِ شعبۂ اردو، فارسی، عربی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یوں تو اردو شعر و ادب کے وسیلے سے کشمیر سے باہر کا اردو داں طبقہ ''گلشن کشمیر'' کی فسوں سازیوں اور ''سیاہ چشمانِ کشمیری'' کی سحر کاریوں سے نا آشنا نہیں ہے لیکن بہت کم مواقع ایسے آئے ہیں جب وہ یہاں کے داخلی اور معنوی لینڈ سکیپ کی بوقلمونیوں اور وسعتوں سے ہمکلام ہوئے ہوں۔ کرشن چندر جیسے ادیبوں اور شاعروں نے کشمیر کو نظر نوازی اور لطف اندوزی کا موضوع بنا کر اسکی جو تصویر پیش کی ہے وہ ''لایئے شیراز سے مے پیجئے کشمیر میں'' کے کیف آور تصوّر کی ہی ایک صورت ہے۔ یہی حال ہندوستانی فلم سازوں کا بھی رہا کہ جنہوں نے ممبئی جیسے شہروں کی کہانیوں میں رنگ بھرنے کیلئے کشمیر کے نظاروں کو عکس بند تو کیا لیکن ان صداؤں سے اعتنا نہیں کیا جو یہاں کی روح اور یہاں کے داخلی تشخص کی آئینہ دار ہیں۔ ہر چند کہ اقبال نے ''ایران صغیر'' کی محکومی و مجبوری کے المیہ کا

احساس دلایا لیکن سلگتے چناروں کا دھواں اسکے بعد شاید ہی کسی کو نظر آیا۔ اردو کے ذہین و فطین افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کو بھی اپنے کشمیری الاصل ہونے کا ثبوت دینے کیلئے ''ہاتو'' کا تمسخر آمیز لفظ ہی ملا۔ تاہم کشمیر کے اردو ادیبوں اور شاعرں میں سے چند نام ضرور ایسے ہیں جنکی تخلیقات میں کشمیر کی روح جلوہ گر ہوئی ہے، کیونکہ جینوین فنکار اپنی زمین اور زمانے سے ماوا ہوتے ہوئے بھی بہر حال اس سے متاثر ہوتا ہے، مثلاً پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، حامدی کاشمیری اور حکیم منظور کے یہاں کشمیر کی خارجی اور باطنی زندگی کے متنوع رنگ بولتے ہیں۔

کسی بھی قوم کی زبان اسکی اجتماعی زندگی کے ہمرکاب ہوتی ہے کیونکہ زبان کی اپنی ایک آرکی ٹائپل اہمیت بھی ہے جس کی رو سے تخلیقی سطح پر اجتماعی لاشعور کی گہرائیوں اور وسعتوں تک رسائی کا یہ ایک کارآمد وسیلہ ہے۔ اس پس منظر میں کشمیر کے داخلی منظر نامے کے استحسان کیلئے کشمیری شعر و ادب کا بھی مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر لازمی ہے کہ اردو زبان بھی کشمیر میں تخلیقی اظہار کے ایک معتبر ذریعہ کا درجہ اختیار کرگئی۔ اس لیے ایک حد تک یہ یہاں کی

اجتماعی سائیکی کا ایک اہم حصہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس صورت حال میں اردو اور کشمیری یہاں تخلیقی سطح پر ایک دوسرے کے قریب ہیں یہاں تک کہ دونوں کی مروجہ تلفیظ بھی بہت حد تک مشترکہ ہے جسکی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پچھلے چھ سو برس سے کشمیری زبان کے تہذیبی اور تمدنی سرچشمے وہی رہے جو اردو زبان کو سیراب کرتے رہے ہیں۔ کوئی عجب نہیں کہ تخلیقی ادب کی اصناف بھی ان دونوں زبانوں میں مشترک ہیں جن سے انکے باہمی رشتے کی تصدیق ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کشمیری شعر و ادب قابل قدر حد تک اردو ادب سے فیضان حاصل کرتا رہا ہے، یہاں تک کی مختلف ادبی رویوں اور رجحانات کے سلسلے میں اردو شعر و ادب اسکے لیے ایک اہم سرچشمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو اور کشمیری کے اس مستحکم رشتے کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں کے ادب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور ساتھ ہی انکے کلاسیک کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔

پروفیسر مجید مضمر
(کشمیری ڈراما اور فکشن)

دو باتیں کشمیری افسانے کی

کشمیر میں کتھاؤں اور کہانیوں کی روایت بہت پہلے سے موجود تھی۔ گیارہویں صدی میں ایک کشمیری برہمن سوم دیو نے کشمیر کی ہزار دلیلیں جمع کر کے انہیں ایک کتابی صورت بخشی جس کا نام ''کتھا سرت ساگر'' رکھا گیا۔ بارھویں صدی میں بھی ایک ایسی ہی کوشش کر کے اوتار بھٹ نے کئی کتھائیں اور دلیلیں جمع کر کے ''بانا سر کتھا'' نام سے شائع کیں۔ اس کے بعد جب انگریزی محقق کشمیر وارد ہوئے تو وہ یہاں کی زبان و ادب اور کلچر پہ تحقیق کرنے لگے۔ نولز جو کہ ایک انگریزی محقق تھا' نے ۱۸۸۷ء میں کشمیری لوک

کتھاؤں کو جمع کر کے "Folk Tails of Kashmir" نام سے شائع کیں۔ اس کے بعد سر آرل سٹائن نے بھی کشمیری لوک دلیلیں "Hatim Tales" کے نام سے جمع کیں جنہیں پھر گریرسن نے ۱۹۲۳ء میں انگریزی ترجمے کے ساتھ لندن سے چھپوایا۔ اس طرح کشمیر میں افسانوی نثر کی داغ بیل پڑنے لگی۔ لیکن انیسویں صدی میں جب ترقی پسند تحریک نے برصغیر میں اپنا سکّہ جمایا تو کشمیر میں بھی کئی ادیب شعوری طور پر دوسری زبانوں کے ادب اور دنیا کی نئی تبدیلیوں سے واقف ہو چکے تھے۔ چونکہ کشمیر میں کئی اردو ادیبوں نے ترقی پسند تحریک کے اثر تلے افسانے لکھنے کی پہل کی تھی جس کی شروعات پریم ناتھ پردیسی نے ۱۹۳۲ء میں کی۔ کشمیر میں اردو افسانے کی پہل کے بعد ۱۹۵۰ء میں کشمیری افسانہ لکھنے کا بھی تجربہ کیا گیا۔ اس تجربے کی ابتدا سوم ناتھ زتشی نے اپنے افسانے ''جب پو پھٹی'' (ییلہِ پھوٗل گاش) اور دینا ناتھ نادم نے افسانہ ''جوابی کارڈ'' سے کیا۔ ''جب پو پھٹی'' افسانے میں ایک شکستہ خواب کا منظر دکھایا گیا ہے جب کہ 'جوابی کارڈ' میں انقلابی جوش اور دیہی ماحول میں آپسی بھائی چارے کو پیش کیا گیا۔

کشمیری افسانے کی اس شروعات کے بعد یکے بعد دیگرے کئی ادیب اس صنف کی طرف مرغوب ہوئے۔ لیکن ابتداء میں اکثر افسانوں کے پلاٹ اور کہانی ایک جیسی تھی جن میں دینا ناتھ نادم کا ''شینہ پتھو پتھو''، عزیز ہارون کا ''زون تہٕ بژم''، نور محمد روشن کا ''نبہ تہ گٹہٕ'' اور مرزا عارف کا ''رے'' وغیرہ ایک ہی قالب کے تھے۔ اسکے بعد اختر محی الدین صنفِ افسانہ کی طرف متوجہ ہوئے جو پہلا کشمیری حقیقت پسند افسانہ نگار گِنا جاتا ہے۔ انہوں نے افسانوی صنف کو تخلیقی دنیا سے نکال کر عام زندگی سے متعارف کرایا۔ اختر نے پہلے پہل اردو افسانے بھی لکھے لیکن بہت جلد کشمیری افسانے کی طرف اپنی پوری توجہ مرکوز کی اور کشمیری افسانے میں بڑی تیزی سے ترقی کے منازل طے کرتے گئے۔ اختر نے مثالی دنیا کو ایک طرف چھوڑ کر اپنے سماج کے مختلف طبقوں کے قریب ہو کر فرضی کرداروں کے بدلے حقیقی کرداروں کو اپنے افسانوں میں حرکت بخشی۔ یوں انہوں نے کشمیری افسانے کو نئی جہت بخشی۔ انکا پہلا افسانوی مجموعہ ''ستھ سنگر'' (سات چوٹیاں) کشمیری افسانوں کا پہلا مجموعہ بھی ہے جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اسی دور میں ان کے کئی افسانے جن میں

''ڈ ریا یہ ہُنڈ بیز ار''، ''دندوزن''، آدم چھُ عجب ذات'' وغیرہ کافی مشہور ہوئے۔ یہ افسانے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے بہترین افسانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بقول برج پریمی ''پلاٹ بنُت، کرداروں کی تہہ داری، مکالموں کی برجستگی اور اسلوب کی شادابی نے افسانوں میں حسن اور اثر پیدا کیا''۔

اختر کی اس کوشش اور کاوش سے انکے کئی ہمعصر ادیب اس صنف کی طرف راغب ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کشمیری صنف افسانہ کا ایک بڑا کارواں نمو پذیر ہوا۔ جن میں علی محمد لون، صوفی غلام محمد، امین کامل، دیپک کنول، امیش کول، اوتار کرشن رہبر، تاج بیگم، بنسی نردوش، ڈاکٹر شنکر رینہ وغیرہ شامل ہیں۔

علی محمد لون (جو کہ بنیادی طور پر ڈراما نگار تھے) نے اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں افسانے لکھے۔ کشمیری میں ''یم لۄکھ'' (یہ لوگ)، ''موغلی غفارا''، ''شنۍ''، (خلاء) جیسے افسانے لکھ کر کشمیری افسانے کے فنی خدوخال کے تئیں اپنا خاص رول ادا کیا۔ امین کامل (جو کہ کشمیری زبان کے نمایاں شاعر تھے) نے شاعری کے علاوہ افسانوی ادب میں بھی اپنا خاص رول ادا کیا۔ انہوں نے کئی

خوبصورت افسانے اور ناول لکھ کر اپنا لوہا نثری صنف میں بھی منوایا۔ انہوں نے اپنے افسانے ایک الگ انداز میں پیش کئے جن میں کرداروں کی نسبت لطیف جذبات پر توجہ مرکوز کی گئی۔ ان کے افسانوں میں کرداروں کی ذہنی کشمکش فطری مناظر سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔

کشمیری افسانے کے ابتدائی دور میں امیش کول نے بھی کئی خوبصورت افسانے لکھے جن میں ''اڈے کتھ''، ''لیس واری کھیوان چھِ''، ''دل'' وغیرہ افسانے اہم ہیں۔ ان افسانوں میں کرداروں کی داخلی کیفیت پر خاص توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ اسی دور میں صوفی غلام محمد بھی افسانوی ادب کی طرف راغب ہوئے۔ صوفی غلام محمد کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پہ آئے جن میں ''شیشہ تۂ سنگستان'' (شیشہ اور سنگستان) اور ''لوسمتۍ تارکھ'' (ڈوبے ستارے) ہیں۔ ''ژنہ ژور'' (کوئلہ چور) ان کا پہلا افسانہ ہے جو بہت ہی مقبول ہوا۔ اسی دور میں پہلی کشمیری خاتون تاج بیگم صنف افسانے کی طرف متوجہ ہوئی اور اپنے افسانوی مجموعے ''الاو'' کو منظر عام پر لے آئی۔ ان کے افسانوں میں کشمیری ماحول کی بھرپور عکاسی کی گئی

ہے۔ وہ جس سماج میں جیتی ہے اسی سے وہ اپنے افسانے بھی تخلیق کرتی ہے۔ ان کے افسانے ''برم''، راجہ''، ''ہلہ کر''، ''حبسہ کر''، ''آستان ڈیڈِتل''، ''بوبنز صوبدآری'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۹۵۹ء کے بعد جو افسانہ نگار اس صنف میں قلم آزمائی کرنے لگے اور اپنی محنت سے اس صنف کا دامن وسیع کیا ان میں بنسی نردوش، دیپک کول، غلام رسول سنتوش، ہردے کول بھارتی، عباس تابش، شنکر رینہ، غلام نبی بابا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں نے اپنے مشاہدے اور فکر سے کشمیری لوگوں کی زندگی کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی مسائل اجاگر کئے۔ یوں صنف افسانہ کشمیری رنگ میں رنگنے لگی۔ ان افسانہ نگاروں نے یہاں کے لوگوں کے جذبات، عقیدت، سماجی روایت کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ علاوہ ازیں سیاسی ریاکاری سے بھی پردہ اٹھایا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے موضوع کے علاوہ افسانوی ہئیت، اسلوب اور فکری پہلو کے متعلق انفرادی طور کچھ نئے تجربے بھی کئے۔ افسانہ نگار سیاسی پروپگنڈا اور انقلابی رجحان ترک کرکے اپنے سماج میں پنپ رہے مختلف زیادتیوں، سماجی نابرابری، دکھ اور پریشانیوں سے پردہ ہٹا کر

اصل حقیقت سے واشگاف کرانے لگے۔

جدید افسانے کا دور کشمیر میں ۱۹۶۷ء کے بعد شروع ہوا ۔اس دور میں کشمیری افسانے میں فکری اور ہیئتی طور پر ایک بڑی تبدیلی آئی اور صنف افسانہ کے متعلق ادیب سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ بحث ومباحثے کا آغاز ہو کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھنے لگے جن میں اختر محی الدین، رتن لال شانت، ہردے کول بھارتی، امین کامل وغیرہ چند اہم افسانوی تنقید نگار شامل ہیں۔ جدید افسانے میں پلاٹ ،کردار ،ہئیت اور تکنیک میں نئے تجربے کئے گئے۔ ان افسانوں میں سماج اور جماعت سے زیادہ انفرادیت کی اہمیت تھی۔ جس کی وجہ سے ان افسانوں میں خارجیت سے زیادہ داخلیت اور کردار کے خارجی خدوخال کے بجائے اسکے داخلی وجود کی طرف خاص توجہ مرکوز کی گئی۔ جن افسانہ نگاروں کے یہاں یہ بدلاؤ خاص طور پر نظر آتا ہے ان میں اختر محی الدین، ہری کرشن کول اور فاروق مسعودی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اختر نے ایسے افسانے تخلیق کئے جن میں خارجی واقعات کے بدلے تمثیلی واقعات کو اہمیت دی گئی۔ ہری کرشن کول واقعہ سے زیادہ کردار پر زور دینے لگے۔ انکے اکثر

افسانے طنزیہ انداز کے ہیں۔ انہوں نے ایسے افسانے تخلیق کیۓ جن میں ان عناصر کی عکاسی کی گئی ہے جو اپنا مقصد حاصل کرنے کیلیۓ باشعور سماج کو بیوقوف بنانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ انکے افسانوں میں کردار اور واقعات یوں پیوسط ہیں جس سے افسانے میں ڈرامائی انداز پیدا ہوتا ہے۔

رتن لال شانت (جو صنفِ افسانہ کے ہیئتی اور تکنیکی لوازمات سے باخبر ہیں) نے خارجی حقیقت پسندی کے علاوہ ایسے افسانے تحریر کیۓ جنہوں نے کشمیری افسانے میں علامتی اور استعارتی اسلوب قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ شانت نے کشمیری افسانے کو روایتی دلیلی عنصر سے آزاد کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ فاروق مسعودی نے اپنے افسانوں میں جدید موضوعات کو جگہ دی۔ ان کے افسانوی میں جنسیات پر خاص توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں میں موجودہ زمانے کی بے معنویت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کے افسانے ''سماں'' اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔

بشیر اختر بھی اسی دور کا ایک اہم افسانہ نگار ہے جن کے افسانوں میں داستانوی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ انکے اس انداز

سے کشمیری افسانوں میں ایک بار پھر داستانوی رنگت زندہ ہوگئی۔ گلشن مجید نے اپنے افسانوں میں ایک نیا طرز تحریر پیدا کیا ان کے افسانے ''سُہ''، ''مے ما زانکھ'' اور ''افسانہ'' وغیرہ اسکی مثال آپ ہیں۔

اگرچہ پچھلے چند سالوں سے کشمیری افسانے کی مقبولیت تھوڑی کم ہوگئی پھر بھی چند افسانہ نگاروں نے اس روایت کو برقرار رکھا ہے جن میں سید یعقوب دلکش، محی الدین ریشی، بشیر اطہر، رشید راشد، محمد شفیع سمبلی، روپ کریشن بٹ، مجروع رشید، محفوظہ جان، رتن لال تلاشی، آفاق عزیز اور مشتاق احمد مشتاق وغیرہ شامل ہیں۔

مدثر رشید فیروز

ہاکورہ
اننت ناگ کشمیر

خوف

(اختر محی الدین)

''سنو چوزہ مر گیا۔'' یہ اس نے کہا۔

''ہاں تو مر گیا پھر!'' میں خود ہی سوچنے لگا لیکن اسے کچھ نہ کہا۔

''سُن رہے ہو کیا؟'' وہ پھر سے کہنے لگا۔ ''چوزہ مر گیا۔''

میں اسے سرتاپا دیکھنے لگا۔ اچھا خاصا انسان، صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے، دیوانگی کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ ہاں صرف بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں لال اور سوجھی ہوئی تھیں، دائیں ہاتھ میں کالے رنگ کا مردہ چوزہ ایک نظر اس کی طرف اور دوسری میری طرف ڈال رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔ چوزے تو مرتے رہتے ہیں۔ کسی کو چیل لے اڑتی ہے تو کسی کو کتا۔ کوئی اپنے آپ مرتا ہے تو کوئی پالن ہار کے پیروں تلے کچلا جاتا ہے۔ پھر کیا ہوا، مرتے رہتے ہیں۔

جو چوزہ اسکے ہاتھ میں تھا وہ کچھ ایسا بھی نہ تھا کہ اسکے مرنے سے ایک اچھا خاصا انسان جنون کا شکار ہو جائے۔ کالے رنگ کے باریک سے بال، چھوٹے اور موٹے پنکھ، ٹانگیں پتلی، کمر پہ کچھ خارش سی نکلی ہوئی جیسے کوئی مکروہ چیز تھی۔ مگر اس کا دل رکھنے کے لیے اور اس چوزے کے بارے میں جاننے کے لئے میں نے اس سے پوچھا ''شاید کسی اچھی نسل سے تھا! ہے نا؟

''بھاڑ میں جائے نسل'' وہ کچھ تیکھے الفاظ میں جواب دینے لگا۔

''ہمیں اسکی نسل کو کیا کرنا تھا۔ تھا کچھ یا شاید کسی نسل میں ہی نہیں تھا۔ خیر......'' اس کے بعد اس نے لمبی آہ بھرلی۔ کندھوں کو پھیلا کے پھر چوزے کی طرف دیکھ کر تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگا'' مجھے امید نہیں تھی......''

وہ اپنا جملہ پورا نہ کر پایا۔شاید آنسوامڈ آرہے تھے۔

''رہنے والا تو بس ان کا نام ہے'' میں نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

''کن کا؟'' وہ انتشار بھرے لہجے میں پوچھنے لگا، اور سوال بھی اس انداز سے کیا جیسے مجھ سے جواب طلبی نہ تھی بلکہ اپنے پاؤں کی انگلیوں سے پوچھ رہا تھا، کیونکہ نظریں وہی جمائے تھا۔

میں لاجواب ہوگیا اور اب مردہ چوزے کو بغور دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش میں تھا کہ اس چوزے میں کون سا ایسا راز چھپا ہے جو صرف اسے ہی نظر آیا، لیکن میں کچھ بھی دریافت نہیں کر پایا۔ کالے رنگ اور اس پہ چڑھی دھول سے مجھے یہ اور زیادہ شکست خوردہ نظر آنے لگا اور ساتھ ہی پُشت کچھ سفید خارش سی نکلی ہوئی دکھائی دی۔

یہ دیکھ کر مجھے بات کرنے کی وجہ ملی۔

''اس کی پیٹھ پر یہ سفید سا داغ کیا ہے؟''

اس نے چوزے کی پُشت پہ پھر ایک بار اس انداز سے نظر ڈالی جیسے اس نے یہ داغ ابھی تک دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے اس کے پَر اٹھا کر ان کے اندر جھانکنے لگا۔ میں بڑے

اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ چوزے کی پوری پشت پر آٹا جیسا کچھ لگا تھا جو سوکھ کے اب دانے جیسے ہو گئے تھے۔

''اِ۔۔اِ۔۔اسی وجہ سے تو چوزہ مر گیا'' وہ کہنے لگا۔ ''اصل میں کوئی کسی کا ہمدرد نہیں ہوتا۔ ماں باپ، بھائی بہن سب کچھ جھوٹ۔''

''ارے اتنا لمبا فلسفہ کس بات پر!'' میں حیران تھا۔

''یہ ویٹرنری والوں نے اس پر پوڈر چھڑکائی ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''اب اس کو پھینک دینا چاہیے تھا۔'' میں اسے کہنے لگا۔ ''اب اسے یوں دیکھنے سے کیا فائدہ۔''

''ہاں وہی کروں گا۔'' اس نے ایسی لاچارگی سے جواب دیا جیسے کسی اپنے کو دفن کرنا تھا۔

''پھینک دو ادھر نالی میں، کتا یا کوّا کھالے گا۔'' میں اسے کہنے لگا۔

''کیا کہہ رہے ہو آپ!!۔'' اسکی باتوں میں ناراضگی تھی۔ ''اصل میں آپ بھی اسی بیدرد دنیا کے لوگوں جیسے ہو۔''

''تو پھر کیا کروگے اس مردہ چوزے کا!!''

''میرا خیال تھا کہ آپ سمجھ دار ہو اور بات کو سمجھ سکتے ہو۔ خیر ....'' وہ مایوس ہو کے کہہ بیٹھا۔

میں نے خاموشی اختیار کی جیسے کسی بڑی غلطی پر شرم سار تھا۔

''اس بے چارے کو ہر کسی نے ستایا۔ کسی نے بھی اس پر رحم نہیں کیا۔'' وہ کہنے لگا اور کہتے کہتے چوزے کو اپنے دائیں ہاتھ سے سینے کے قریب لا کر یوں دیکھنے لگا جیسے اس پر اپنا آبِ چشم ڈال کر اسے تازگی بخشے گا۔

''یہ بھی اکیس دن گھاس بھرے ڈبّے میں گرمی سیکتا ہوا نہ جانے کون سے ارمان لیے اس دنیا میں آیا تھا۔'' وہ شاید چوزے کو کہہ رہا تھا یا پھر خود کو۔

''آپ نے گھاس بھرے ڈبّے میں کبھی ننھے سے چوزے کو دیکھا ہے؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگا اور میں نے جواب دیا ''ہاں دیکھا ہے۔''

''کتنا معصوم ہوتا ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''پیدا ہوا بچّہ ، بچھڑا، چوزہ اور پھول ، یہ سب ایک ہی مزاج کے ہوتے ہیں، ان کو

کسی چیز کا خوف نہیں ہوتا۔ ان کو لگتا ہے کہ قدرت کا یہ سارا کارخانہ ان کو پالنے پوسنے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔''

میں بس سنتا رہا اور وہ اپنی بات آگے بڑھاتا گیا۔ ''اگر میں زور سے ہاتھ کھڑا کر دوں تو آپ ڈر جاؤ گے۔ کیوں؟ کیونکہ آپ میں خوف کا جذبہ ہے جسے اب آپ ختم نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس اگر دودھ پیتے بچے کی گردن پر تلوار بھی رکھو گے تو وہ پھر بھی ہنسے گا۔ کچھ سمجھ آیا۔ ہا۔ ہا......'' وہ تھوڑا ہنسنے لگا۔ ''پھول کو اگر پہلے ہی پتہ چلے گا کہ وہ کٹنے والا ہے تو وہ خوف سے برگ برگ ہو جائے گا۔''

میں اب ہنس نہیں رہا تھا بس سوچ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بڑا کاروان نظر آ رہا تھا۔۔۔ سبھی ہنس رہے تھے۔ سبھی خوش تھے۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں بچّے، پھول، چڑیاں، کوّے اور چیل گا رہے تھے۔

''ان کی قدرت۔'' میں نے اسے کہا۔

''کن کی قدرت؟'' اس نے جیسے یہ الفاظ میرے چہرے پہ دے مارے۔ میں حیران ہو گیا۔

''ڈر گئے کیا؟'' وہ ہنس کر بولا۔ ''آپ بھی خالی ہو، خالی

اور پھیکے۔آپ نہیں جانتے اس چوزے کو پتہ نہیں کہاں سے چیل پنجہ مار کر اٹھا لائی اور بے رحم ناخون اس کے سینے میں دبا دیئے۔ کسی جگہ بیٹھ کر مار دیتی۔کیا؟ اس کی جان لیتی۔لیکن کسی خوف سے پنجوں سے چھوٹ گیا اور سیدھے ہمارے آنگن میں گر پڑا۔''

''اچھا!'' اب میں سنجیدگی سے سننے لگا۔

''آنگن میں گر کر اس پر میری اور ایک کتّے کی نظر ایک ساتھ پڑھ گئی۔ ہم دونوں اس کی طرف دوڑنے لگے، میں بھی اور کتا بھی۔لیکن مجھ سے پہلے کتا پہنچ گیا۔ چوزے کو پکڑ کر مارنے لگا۔میں نے ہاتھ میں پتھر اٹھایا۔خوف کی وجہ سے کتا چوزے کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔اب میں اکیلا تھا۔چوزہ ڈگمگا کر بھاگنے کی کوشش میں تھا اپنی پتلی لمبی ٹانگوں سے۔زور زور سے چوں چوں کی آوازیں نکالتا ہوا شاید اسے پکارتا تھا جس نے گھاس کے ڈبے میں اسے سانسیں عطا کی تھیں۔مگر کہاں بھاگتا، میں نے پکڑ لیا۔میں نے۔''

یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر خاموش ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد اس نے 'اھم' کر کے اپنا گلا صاف کیا اور مجھ سے پھر کہنے لگا۔''مان لو اچانک شیر یا سانپ یا پاگل کتے آپ کے پیچھے آپ کو مارنے کے لئے

دوڑیں گے۔اس وقت آپ کی حالت کیا ہوگی۔ کہو کہ آپ بیان ہی نہیں کرسکتے۔آپ کیا کوئی بھی اس حالت کو بیان نہیں کرسکتا۔ وہ بھی نہیں بتا سکتا جو کبھی ایسے حالات میں پھنسا ہوگا۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر سارے حواس بے ہوش ہوجاتے ہیں۔ انسان بس بھاگتا ہے۔ کہاں؟ اس کی خبر نہیں ہوتی۔ انسان بس دیکھتا ہے۔ کیا؟ وہ بھی پتہ نہیں ہوتا۔ انسان بس کہتا ہے۔ کیا؟ وہ بھی نہیں جانتا۔

میں نے اس چوزے کو پکڑا۔ ڈر سے اسکی آنکھیں پھٹی اور سوجی ہوئی تھیں۔خوف سے بس چوں چوں کررہا تھا۔شاید رو رہا تھا۔شاید منتیں کررہا تھا۔شاید کہہ رہا تھا کہ میں نے کیا بگاڑا آپ سب کا۔ میں ایک چوزہ ہوں بس چوزہ۔ اگر مرغا ہوتا تو اذان دیتا، مرغی ہوتی تو انڈا دیتی لیکن میں صرف چوزہ ہوں میری کون سی خطا ہے۔

ہمارے گھر میں بھی مرغے ہیں۔ ایک مرغا صبح وشام اذان دیتا رہتا ہے۔ مرغیاں کبھی گاتی رہتی ہیں تو کبھی انڈے دیتی ہیں۔ ایک اچھا سا مرغ ڈربا ہے جیسے آباد گھر۔ ایک مرغے کے ساتھ دو چار مرغیاں۔ میں نے سوچا کہ یہ چوزہ ان کے ساتھ ہی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ دھیرے دھیرے بڑا ہوگا، بڑا ہوکے ذبح کریں گے

اور ذبح کر کے کھائیں گے۔ میں نے اس چوزے کو ان مرغوں کے ساتھ رکھا یہ سوچ کر کہ اپنی نسل کے ساتھ رہ کر اس کا ڈر اور خوف دور ہوگا۔''

''گھنٹہ بھر بعد میں ڈربے میں رکھے اس چوزے کو دیکھنے گیا۔ آپ کو پتہ ہے وہاں کیا ہوا تھا۔'' اس نے چوزے سے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا، ہونٹوں پر زہر اگل رہا تھا۔ مجھے اس انداز سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ خود خدا تھا اور میں گنہگار بندہ۔ تھوڑی دیر یوں ہی دیکھنے کے بعد کہنے لگا ''چوزے کو باقی مرغوں نے چونچ مارتے مارتے پوری پیٹھ کی خال ادھیڑ دی تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی بھی نظر آ رہی تھی۔ خون کے فوّار پھوٹ رہے تھے اور ایک کونے میں تھکا ہارا بیٹھا تھا۔''

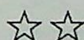
''میں اسے پکڑنے لگا۔ یہ بھاگ بھی نہیں پایا۔ ہاتھ میں اٹھایا۔ پھڑ پھڑایا بھی نہیں۔ بس دھیرے دھیرے چوں چوں کرتا رہا۔ کچھ کہہ رہا تھا۔ شاید یہ کہ ''اب میں مرنے والا ہوں۔ ہو گئے خوش؟ تجھ سے پوچھ رہا ہوں، اے انسان، کتے، چیل، مرغے۔ خوش ہو گئے کیا؟ اب میں مرنے والا ہوں۔ کوئی اذان نہیں دوں گا، انڈا

نہیں دوں گا، کچھ نہیں کروں گا۔ ہاں بس وہی کروں گا جس سے ہر کوئی خوش ہو گا۔ بس اپنی جان دوں گا...... چوں چوں چوں۔"

اپنے ہاتھ پہ لے کر اسے دانے ڈالے۔ اس نے ایک دو چونچ کھالیں۔ شاید بھوک تھی یا شاید یہ سوچ کر کھایا کہ چلو اب اس کا دل خوش کرنے کے لیے ہی کھاتے ہیں۔ کیا فرق پڑے گا۔

کہتے ہیں خدا بے نیاز ہے۔ ویٹرنری والوں نے اس پر پوڈر چھڑکی۔ میں نے اسے گرمی میں رکھا۔ لیکن اب یہ مجھ سے نہیں ڈرتا تھا۔ اب یہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اب یہ بس چوں چوں کر رہا تھا۔ مجھے تانے دے رہا تھا۔ دھیرے دھیرے چیں چیں کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میری روح سے باتیں کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "اب تو خوشی ملی، کتے، انسان، چیل، مرغے، خوش ہوئے کیا؟ لو اب میں مر رہا ہوں۔"

"گھنٹہ بھر بعد مر گیا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ پھر ایک بار چوزے کو دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "سن رہے ہو کیا؟ آخر مر گیا۔"



دھری دو آنکھیں

(اوتار کرشن کول)

کھٹاک ......چھن ......

شاید کھڑکی کا شیشہ گر کر چکنا چور ہوا۔ ایک اکیلا شیشہ کھڑکی میں باقی رہا تھا۔

میرے احساسات جاگ اُٹھے۔

ہائے یہ شیشہ کیوں کر ٹوٹا......شگاف پڑا ہی ٹھیک تھا۔ شاید اسی شگاف نے اسے مار ڈالا۔ ہاں شگاف تو مار ہی دیتی ہے۔ کاش کاغذ ہی چپکایا ہوتا، چکنا چور نہ ہوتا۔ اُف! یہ ٹوٹا شیشہ اب میرے دل میں بھی رخنہ ڈال رہا ہے۔ اُف یہ درد! یہ کیا ہو رہا ہے مجھے،

میرے وجود کو۔ جی چاہتا ہے کہ زور زور سے چلاّ ؤں۔ لیکن یہ میرے گلے کو کیا ہوا۔ صحرا کی طرح سوکھ گیا۔ زبان گونگی پڑ گئی۔ اب اس کھڑکی کا کیا کروں۔ کڑاکے کی سردی اندر آرہی ہے۔

شؤ۔شؤ۔شؤ۔ یہ تیز ہوا ہے یا کوئی گھوڑا دوڑ رہا ہے۔ ٹھنڈی برفیلی ہوائیں شیر کی طرح پنجے پھیلا رہی ہیں۔ اُف یہ رات کالی اور گہری کھائی جیسی۔۔ کتنی لمبی۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک صدا دینا، اسکا پینڈولم کبھی تھکتا بھی نہیں۔ کبھی پل بھر ٹھہر ہی جاتا۔ کبھی لمحہ بھر رک ہی جاتا۔ اُف ابھی رات کے ایک ہی بج گئے۔ اسکے بعد ڈیڑھ بجے گا، پھر دو بجیں گی، پھر سوا دو۔ یہ ایک لمبا سلسلہ ہے۔ اتنا وقت کب بیتے گا۔ یہ رات، اژدھا جیسی رات۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ کھڑکی بھی زور زور سے ہلنے لگی۔ اتنے لوگ اس گھر میں رہ رہے ہیں پھر بھی میں اکیلا۔ نہ۔ نہ۔ نہ۔ میں اکیلا کہاں ہوں۔ یہ کرسیاں، وہ میز، یہ بھی تو میرے ساتھ ہیں۔ وہ دیوار پر لٹکا کلینڈر۔ کلینڈر پر بنی تصویر۔ گنیش کا بنا فوٹو اور اسکی لمبی سونڈ، چھوٹی آنکھیں۔ انسانی وجود پر ہاتھی کا سر۔ ایک ناہموار جسم کی علامت۔ بے توازن صورت۔ ایک ناہموار جسم کو لوگ پوجتے ہیں۔ کیا یہ خوبصورتی کی علامت ہے؟۔۔ اُف مجھے یہ کیا

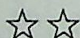
ہو رہا ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ دیکھو! دیکھو! اس دریچے سے ایک سایہ اندر آ رہا ہے۔ سایہ۔ دو آنکھیں ہوا میں ادھر اُدھر گھوم رہی ہیں۔ یہ دو آنکھیں ہوا میں دھری رہ گئیں۔ اُف میرا گلہ دب نہ جائے۔ یہ آنکھیں دھری ہوئی دو آنکھیں۔ میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ اُف! میں نہیں۔۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ عذابِ شدید۔۔ یہ وہ آنکھیں نہیں ہیں۔ وہ انداز وہ کشش ان آنکھوں میں نہیں ہے۔ آنکھیں مریم ہیں۔ آنکھیں عیسیٰ ہیں۔ محبت اور شفقت کا سرچشمہ۔ سولی پہ چڑھ کے بھی اپنا سارا دکھ درد چھپا کر ہم سب پر رحیم بنی ہیں۔ آنکھیں ہی خوبصورتی ہے۔ گلِ نیلوفر کا داغ اور گلاب کی رنگت، تتلی کا رقص اور جنگل میں ہرن کی دوڑ۔ مگر۔ نہیں۔ نہیں۔ آنکھیں کالی کا غصہ اور چنڈی کا تاپ ہیں۔ نہیں نہیں۔ یہ آنکھیں یہ ان سب سے الگ ہیں۔ چمکیلی آنکھیں، سراب پہ دھری آنکھیں۔ اُف میرا کلیجہ پھٹ نہ جائے۔ یا تو میرا وجود ہی غائب ہونا چاہیے یا پھر یہ دو آنکھیں۔ لیکن۔۔ لیکن یہ آنکھیں میری طرف کیوں نہیں دیکھتیں۔ ان آنکھوں کو میں پوری طرح جانتا ہوں۔ ان آنکھوں کو یہ کمرہ بہت عزیز تھا۔ اس کمرے کی دیواریں، سب کچھ،

وہ کلینڈر جس پر گنیش کی تصویر بنی ہے۔ مگر۔ نہ۔ نہ۔ مجھے خبر نہ تھی۔ کلینڈر ایک تجارت ہے اور یہ آنکھیں بھی تجارت کی تلاش میں تھیں۔۔۔ کس شوق سے میں نے کھڑکی میں یہ شیشے لگوائے تھے۔ رنگ برنگی شیشے۔ یہ آنکھیں ان کو دیکھ کر حیران ہوتی تھیں۔ ان آنکھوں کو کتنی محبت تھی مجھ سے، میرے جسم سے اور میری خوبصورتی سے۔ اُف وہ وقت!۔۔ وہ وقت آ گیا۔۔ میں زخمی ہوگیا۔۔ میں گر گیا۔ حد سے زیادہ زخمی ہوگیا۔ اتنے گھاؤ لگنے کے بعد بھی کیسے بچ گیا؟ مجھے اسپتال پہنچایا گیا۔ میری دونوں ٹانگیں مجھ سے جدا کر دی گئیں۔ صرف آنکھوں کی بینائی باقی رہ گئی۔ وہ بینائی جس سے میری پہچان تھی۔ لیکن وہ روشنی مجھ سے دور ہونے لگی جو میری راہ کو ہموار کرتی تھی۔ مونالیزا کی آنکھیں بدل گئیں اور میں گہرے اندھیرے میں پھنس گیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ان آنکھوں کو صرف میرے شریر سے محبت تھی۔۔

اُف! یہ مجھے کیا ہوا۔ کہیں میرا کلیجہ چھلنی نہ ہو جائے۔ میری بے چینی بڑھ رہی ہے۔ میں یہ کس کینسر واڈ میں بھیجا گیا ہوں۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ لیکن کینسر کا علاج نہ ہو پایا۔ درد ابھی بھی برقرار ہے۔ اُف

یہ درد میرا شریر چھلنی ہورہا ہے۔ یہ آنکھیں جتنی دور ہوتی جاتی ہیں اتنا ہی میرا گھاؤ انہیں قریب تر کردیتا ہے۔ نفرت ہے مجھے ان آنکھوں سے۔ میں ان سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس اکیلے پن کا کیا جو انہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے لے آتی ہیں۔ میں کیا کروں؟ ۔۔میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ کچھ بھی نہیں۔

ان آنکھوں کی قربت بھی اب میرے وجود کے ساتھ ہی ختم ہوجائے گی۔ اُف جی چاہتا ہے زور زور سے چیخوں، چلاّؤں۔ مگر وہ آواز کہاں سے لاؤں۔ لیکن یہ گنیش کس بات پہ ہنستا رہتا ہے؟ اپنے ناہموار جسم پر یا میرے ۔۔۔ دیکھو بڑا سا گدا ہاتھ میں اٹھا رکھا ہے۔۔۔ میں۔ میں۔ میں بھی گدا اٹھاؤں گا۔۔ میں بھی ہنسوں گا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ بے جھجک اور بے تحاشا ہنسوں گا۔۔۔ ہاہاہا۔۔



چکور

(ہردے کول بھارتی)

''بالکل اسی جگہ سے چکور اپنی اڑان بھرتا تھا۔''

''ہاں معلوم ہے''۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ بس کے انتظار کا کرب کچھ کم کرنے کی خاطر یونہی اپنی بات بڑھا رہی تھی اور میں اس اضطراب کا اب عادی ہو چکا تھا بلکہ اب یہ میری زندگی کا معمول بن گیا تھا۔

''تب یہ پیڑ یہاں نہیں تھا۔'' اس نے کہا۔

''وہ بھی مجھے معلوم ہے''۔ میں نے تنگ آ کر اسے جواب دیا۔ ''نا ہی لوگ یہاں پہ بس کے انتظار میں تھے، نہ یہ پکی سڑک تھی

اور نہ ہی وہ بجلی کا کھمبا۔''

میں اس خیال میں تھا کہ اس کے بعد وہ خاموش ہو جائے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میری ان باتوں سے وہ کچھ بے قرار ہو گئی شاید اسے محسوس ہوا کہ میں اس کی ان باتوں میں دلچسپی لے رہا ہوں۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں وہی سنا ہے میں نے۔'' میں نے پھر بات کو مختصر کرنے کی کوشش کی۔ ''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس چکور کو چاند نگلنے کی ہوس تھی تو کچھ لوگوں کا خیال کہ اسے چاند کو گلے لگانے کی خواہش تھی۔''

''سچ کیا ہے؟'' اس نے اس انداز میں سوال کیا مجھے لگا کہ وہ سچ میں یہ سب جاننا چاہتی ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ چکور کو چاند نگلنے کی ہوس تھی یا اسے گلے لگانے کی تمنّا؟

''رب جانے ہوس تھی یا محبت'' میرا جواب سن کر وہ دل ملول ہو کر تھوڑی دیر خاموش ہو گئی۔ میں خوش ہو گیا کہ بس کے انتظار کرنے کا ستم اب وہ برداشت کرے گی اور مجھ سے اب کچھ نہیں پوچھے گی۔ لیکن وہ جیسے خواب میں باتیں کرتے ہوئے کہنے لگی:

''پورا چاند جونہی آسمان پر نمودار ہوا وہ ایک نگاہ بس ایک نگاہ چاند کی

طرف شاید یہ دیکھنے کیلئے اٹھا رہا تھا کہ مجھے کہاں تک پہنچنا ہے۔ پھر پوری رفتار کے ساتھ اپنی اڑان اسی چاند کی طرف بھرتا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ یوں خاموش ہوگئی جیسے اس پل میں وہی پرواز بھر رہی تھی۔

''اس کے بعد؟۔'' اب میں بھی اس سے پوچھنے لگا اور وہ جیسے خواب سے بیدار ہوگئی۔

''اس کے بعد کیا۔'' اس کی آواز جیسے کھوکھلی ہوگئی۔ ''پھر وہ آدھے راستے میں ہی تھک کر اسی رفتار سے آگرتا تھا جس رفتار سے اوپر اڑا تھا اور نیچے ...... نیچے ......'' کہتے کہتے جیسے اس کے الفاظ کھوگئے اور میں نے اس کا جملہ پورا کیا۔

''......اور نیچے زمین پر وہ بکھر جاتا تھا۔ جسم کے حصوں سے کیڑے پیدا ہوتے تھے۔ کیڑے ایک دوسرے کو کھاتے تھے۔ آخر میں ایک ہی زندہ رہتا تھا اور وہی کیڑا پھر سے چکور بن کر چاند کی طرف اڑتا تھا۔ رب جانے نگلنے کی ہوس سے یا گلے لگانے کی آرزو سے۔''

اس کو میری یہ بات سن کر نہ جانے کیا لگا کہ وہ میرے اور قریب آکر دھیرے سے کہنے لگی۔

''تجھے اگر اتنا سب پتہ ہے تو یہ بھی خبر ہو گی کہ اب وہ کہاں ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اسے کیا ہوا؟ وہ خواہش کیوں چھوڑ دی؟''

''خواہش یا ہوس'' میں نے اسے پوچھا۔

''وہ مجھے معلوم نہیں۔'' یہ کہتے کہتے وہ دوسری طرف مڑ گئی جیسے وہ کچھ چھپانا چاہتی تھی اور مجھے لگا کہ وہ بس کے انتظار کا کرب کم کرنے کیلئے بات نہیں بڑھا رہی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں اپنے اندر دبے کئی جنموں کی اس خلش اور اس کسک کو باہر کیوں نہیں لا پایا۔ شاید اسی کڑواہٹ کے احساس سے میں اسے کہنے لگا۔'' اس کے ساتھ یہ ہوا کہ کوئی آفت آئی، افراتفری پھیل گئی، جانے کیوں، کسی کو بھی خبر نہ تھی۔ شہروں اور گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ کہنے لگے ہم وہ نہیں ہیں جو ہم دِکھتے ہیں اور جو ہم اصل میں ہیں وہ ہم سے چھین لیا گیا ہے۔ کچھ بدل گیا۔ گولیاں چلیں، جلسے ہوئے۔ اس نے بہت سمجھایا تھا کہ میں چکور ہی ہوں، لیکن کسی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ ایک ہی پہچان تھی اس کی چاند تک اڑنے کا حوصلہ۔ لیکن اس کے بعد چاند ہی نہیں نکلا۔ اس نے شاید پہلے ہی ....'' میرا جملہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بول پڑی:

''تم بس یہ بتاؤ کہ چکور کا کیا ہوا؟''

''کیوں؟ میں نے پوچھا۔''

''کیونکہ چاند کا قصہ مختصر ہے اور بس کے آنے میں ابھی کافی وقت ہے۔''

''تو اس کا مطلب تم صرف بس کے انتظار میں ہو۔''

''اور تم......؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

''ہاں تو... ...''

''پھر کیا ہوا چکور کے ساتھ؟'' وہ پھر سے چکور کے قصے پر آگئی۔''

کیا ہوتا، دل ٹوٹا اور اندر ہی اندر خون جم کر نیل پڑ گیا۔ اڑنے کی قوت ختم ہوگئی اور اپنی پہچان کھو بیٹھا۔ زیرگوں نے کہا اسے جونکوں سے علاج کرانا ہے۔ لیکن جونک گر پہلے ہی بستی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کیونکہ اب بستی میں کسی کو نیل پڑتا ہی نہیں تھا۔ اتنا خون اب کسی میں باقی کہاں رہا تھا۔ وہ شاید افراتفری پھیلتے وقت رستوں میں بکھر چکا تھا، خاک میں جذب ہو چکا تھا اور باقی جو کچھ بچا اس نے اپنا رنگ ہی بدل دیا تھا، شکل ہی تبدیل کی تھی۔ اس نے بھی تھک ہار

کے اپنا خون اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہ بدلاؤ پرواز بھرنے کے جنون سے کیا تھا یا پھر چاند کی محبت کی خاطر، یہ سب اسکے سوا کوئی نہیں جانتا۔

میں کچھ اور کہنے کے لیے اپنے الفاظ سمیٹ ہی رہا تھا کہ وہ بے قرار ہو کر بولی:

''ہاں! پھر؟''

''پھر کیا! پھر وہ اپنی پہچان ہی کھو بیٹھا۔''

''اور اب؟'' اس نے پھر سے پوچھا۔

''اب......'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اب وہ بھی تمہاری اور میری طرح کسی جگہ کسی پیڑ کے نزدیک ایسے ہی بس کے انتظار میں ہو گا۔

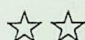
''کہاں پر؟ کس پیڑ کے پاس؟ تجھے اگر اتنا سب معلوم ہے تو یہ بھی پتہ ہو گا کہ وہ چاند کو نگلنے کے ہوس سے اڑتا تھا یا پھر اسکو گلے لگانے کی خواہش سے۔''

اس کی بے قراری اب حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس سے پہلے کہ میں اسکے سوالوں کا جواب دیتا اچانک دو بسیں ایک ساتھ آ

پڑیں۔ وہ اپنی اور میں اپنی بس میں چڑھ گئے اور بس میں چڑھتے چڑھتے میں نے اسے زور سے آواز لگا کر کہا۔

''اس پیڑ کو یاد رکھنا۔ اگلی بار جب ملیں گے تو بتا دوں گا۔''

شاید اسکے بعد پھر کچھ ہوا۔ شاید پھر سے کوئی آفت آئی اور افراتفری پھیل گئی۔ وہ پیڑ سڑک پر دور دور تک کہیں نظر نہیں آیا جو ہمارے دوبارہ ملنے کا پتہ تھا۔



کبھی دھوپ کبھی چھاؤں

(اختر محی الدین)

''کوئی بات کہہ کر پھر اس سے مکر جانا بزدلی ہے''۔ یہ ایک آدمی کہہ رہا تھا۔ ''انسان کو ہمیشہ وہی بات کرنی چاہیے جس سے وہ پھر مکر نہ جائے''۔

''غلط''۔ یہ دوسرے آدمی نے کافی کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ایک چسکی پی کر کہا۔ ''اس کو بزدلی نہیں سیاست کہتے ہیں۔ کوئی بات صرف پروپگنڈے کی خاطر کہی جاتی ہے اور مقصد پورا ہونے پر اس بات سے انکار کیا جاتا ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ اب بس سیاست ہے اور کچھ نہیں''۔

''آپ دونوں روایتی سوچ رکھتے ہو''۔ یہ بات تیسرے

آدمی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی بات نہ پروپگنڈا ہوتی ہے اور نہ ہی کسی بات سے آج کے زمانے میں انکار کیا جا سکتا ہے، بلکہ اب ہر بات کے دو معنی ہیں، وہ بھی متضاد۔''

میں دوسرے ٹیبل پر اکیلے بیٹھے کافی پی رہا تھا۔ اس انداز میں جیسے اپنے ہی حادثوں میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن اصل میں ذہن اُس ٹیبل پر بیٹھے اُن تینوں آدمیوں کی جانب تھا جو سنجیدگی سے کسی بحث میں مشغول تھے۔ شاید یہ تینوں یہی بحث چھیڑنے کافی ہاوس آئے تھے اور ویٹر بنا بلائے سامنے آیا تھا اس لیے کافی منگوائی تھی۔

دوپہر کا وقت اور بہار کے دن تھے۔ دھوپ پہلی بہار کے دنوں جیسی حسین تھی۔ بند کمرے میں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ انسان کچھ کرنا چاہتا تھا یا پھر بنا وجہ دھوپ کھلی سڑکوں پر ٹہلنا پسند کرتا تھا۔

کافی ہاوس میں زیادہ بھیڑ نہ تھی۔ کچھ ٹیبلوں پر میری طرح اِکّا دُکّا آدمی بیٹھے گھونٹ گھونٹ کافی پی رہے تھے پھر آنکھیں ملتے ہوئے سوچنے لگتے تھے یا دائیں بائیں یوں دیکھتے جیسے کسی کو ڈھونڈ رہے ہوں۔

ایک ٹیبل پر بیٹھے یہ تین آدمی اس وقت اس کافی ہاوس کی

پہچان تھے۔ اگرچہ کافی ہاوس میں زور زور سے باتیں کرنا اور قہقہے لگانا فیشن ہے جس سے مجھ جیسے گاہک کو اکثر چڑ ہوتی ہے۔ لیکن مجھے بھی اس وقت ان تین آدمیوں کا شوروغل اس کافی ہاوس کی شان محسوس ہورہا تھا۔ اگر یہ تینوں اس طرح بحث ومباحثہ نہ کرتے تو یہ کافی ہاوس اس وقت قبر جیسا تنگ وتاریک اور خاموش نظر آتا۔

کافی کی تلخی میری سکڑی نسوں کو جھنجھوڑ کر جیسے بیدار کرتی تھی۔ کافی گھونٹ کے بعد سگریٹ کش میری تلخی اور زیادہ بڑھارہا تھا جو میرے جسم کو ایک سرور بخشتا تھا۔ حرکت میری نسوں میں اپنے پنکھ پھیلانا چاہتی تھی۔ میں اب کچھ کرنا چاہتا تھا، کچھ ایسا جو کرنا بہتر ہو۔ انسان نے قدرت کے گریباں کو تھام رکھا ہے۔ دلاوری اور حرب ترقی کے ضامن ہیں لیکن میری نسیں سکڑی ہوئی ہیں۔ حرکت بند ہوچکی ہے۔ روسی خلاء سوار نے چھلانگ لگادی۔ دلاوری کا معراج قدرت کے سمندر میں لعل ڈھونڈنے والا ڈنگل بجھتے ہوئے بھی چمکتا ہے اور راہوں کو منوّر کرتا ہے۔

لگتا ہے مجھ میں کسی چیز کی کمی ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سنا ہے چاند پر زمین کھودی جارہی ہے شاید کاشت کیلئے ...... کہ

نہیں؟ ...... یا پھر لحد ...... لفظوں کے دو معنی ہیں۔ وہ بھی متضاد ......

باہر بادلوں نے آسمان گھیر لیا ہے۔ کھڑکی سے بھی اندھیرا سا نظر آرہا ہے۔ بہار کی خوشگوار دھوپ بھی دھیمی پڑ گئی، یہ دھوپ بھی بے بھروسہ، اک پل ہوتی دوجے پل کھوتی ہے۔ اب ان دھوپ والی سڑکوں پر چلنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ اب بند کمرے میں بیٹھنا ہی بہتر ہے۔

جُنبش اور کاہلی کی کشمکش ۔ دھوپ سینکنے والے یکے بعد دیگرے کافی ہاوس میں جمع ہوتے گئے۔ شور وغل بپا ہو گیا۔ وہاں پر زور زور سے قہقہے لگ رہے تھے تو یہاں پر بنا وجہ بکواس۔ میرے بائیں ٹیبل پر دو مرد اور دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ نہ جانے وہ وہاں پر کب آئیں تھیں۔ مرد زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور عورتیں دھیرے دھیرے ہنس رہی تھیں جیسے کسی بڑے لوہے کے کارخانے میں بیچ بیچ میں شیشے کی چوڑیوں کی چھن چھن ہو رہی تھی۔ یہ چھن چھن لوہے جیسی آوازوں میں سراخ کر کے لوگوں کے کانوں میں موسیقی پیدا کر رہی تھی۔ اس لحاظ سے مانو تو اسی موسیقی نے مجھے ایک بار پھر اپنے اطراف کا احساس دلایا لیکن میری سوچ کسی اور سطح پر تھی۔ میں خود کو

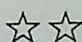
کہہ رہا تھا ''کس کو خبر؟ بلکہ ان چوڑیوں کی کھنک کے معنی بھی مر گئے ہوں گے۔''

میں نے اپنی نگاہ ان عورتوں پر ڈالی، یہ سوچ کر کہ کہیں ان کے چہرے پر ہی کوئی معنی لکھا ہو۔ لیکن بیچ میں دو مردوں کی آنکھیں آ گئیں جو اخبار والے تھے۔ ہم نے آنکھوں سے ہی آپس میں سلام دعا کی۔ یہ بہت خوش و خرم تھے، شاید ان عورتوں کو اپنے کام کا رعب داب دکھا رہے تھے۔ میں مایوس ہو گیا، مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ ان معصوموں کو خبر نہ تھی کہ معنی تو مر چکے ہیں اور الفاظ اب خالی ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ کاغذی کفن اوڑھ کے لفظوں کی لاشوں کا بیوپار کر رہے ہیں۔

کافی ہاؤس میں اب لوگوں کا ہجوم تھا۔ شور بہت بڑھ گیا، سامنے والے ٹیبل پر اب لوگوں نے چیخنا شروع کیا تھا ان کے ساتھ اب اور دو آمی جڑ گئے تھے۔ یہ لوگ کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ میں سن رہا تھا۔ انسانی مفاد، قومی مفاد، اجتماعی مفاد، ذاتی مفاد۔ لفظ بھاری اور ترچھے تھے۔ میرا سر پھٹا جا رہا تھا جیسے کوئی برتنوں پر ہتھوڑے مار رہا تھا۔ ویٹر سفید وردی پہن کر ایک ٹیبل سے

دوسرے ٹیبل امن کے سپاہ جیسے گشت کر رہے تھے، لیکن ان کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

میرے ٹیبل پر اب نوجوانوں کی ایک ٹولی بیٹھ گئی تھی جو ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ کبھی قہقہے لگاتے تو کبھی ایک دوسرے کو دھکا دیتے تھے۔ یہ بڑی لاپرواہی سے کرسیوں پر بیٹھے تھے اور انہیں میرے موجود ہونے کا بالکل بھی احساس نہیں تھا۔ مجھے لگا جیسے میں پیروں تلے کچلا گیا ہوں۔ میں اپنا احساس دلانے کے لئے کبھی کھانستا تھا، سگریٹ سلگاتا تھا، ٹانگیں ہلاتا تھا، تاکہ یہ سب میری طرف دیکھیں، میں ان سے بات کرتا، انہیں سگریٹ پلاتا یا شاید کافی بھی پلاتا۔ بس ان سے اتنا پوچھتا کہ آپ لوگ کس بات پہ ہنس رہے ہو۔ مجھے بھی ذرا ہنسا دو۔ میں کافی عرصے سے ہنسا ہی نہیں .... لیکن انہوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ان لاپرواہ لوگوں نے، ان ظالموں نے .... میں کھڑا ہو کے ٹیبلوں کے بیچ سے نکل کر سیدھے سڑک پر پہنچ گیا۔ سڑک سنسان تھی، بارش برس رہی تھی اور میں اکیلا راہ میں چل رہا تھا............



خلاء

(علی محمد لون)

ویکیوم! لامحدود، وسیع اور دن بدن اپنے حدود وسیع سے وسیع تر کرتا ہوا ویکیوم۔

یہ ویکیوم اس زمین سے دور خلاء میں نہیں بلکہ میرے دل و دماغ میں پیدا ہوا ہے۔ وہ خلاء جو کبھی بھر نہ پائے گا۔

دن اور رات کی گردش......ایک لامعنی شئے

سحر ہوئی۔۔۔اجالا پھیلا۔

رات ہوئی......اندھیرا چھایا۔

دن بھی گزر گیا رات بھی ختم ہوئی۔لیکن مجھے کیا فرق پڑے گا

مجھے تو کسی بات پر سوچنا ہی نہیں آتا۔ نہ میں خود غرض ہوں اور نہ انٹرووارٹ (Introvert) لیکن نہ جانے میرے دوستوں کو کیوں اس بات کی شکایت ہے۔ دراصل مجھے ان کی طرح باتیں کرنا نہیں آتی۔

انٹرووارٹ (Introvert)!

اس لقب پہ مجھے ہنسی آتی ہے۔ ویسے ہنسی نہیں بلکہ ذرا سی مسکراہٹ۔ پھر بھی میں خاموش ہی رہتا ہوں۔ دراصل جب بات کرنی آتی نہیں تو خاموش رہنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔عزیز و اقارب میں بھی یہ بات عام ہوگئی ہے کہ میں بہت ہی کم بولتا ہوں۔

''یہ عقلمندی کی نشانی ہے''۔ بزرگ فتویٰ دیتے ہیں۔

''یہ نحوست کی علامت ہے''۔ چھوٹے مذاق اڑاتے ہیں۔

''ذہن جب باکمال ہوتا ہے باتیں اپنے آپ کم ہوتی ہیں'' کم پڑھے لکھے دوست کہتے ہیں۔

ان ساری باتوں کا جواب میری وہی ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں ان باتوں پر طنز کرتا ہوں بلکہ اس لئے کہ مجھے اپنی اس خاموشی کی کوئی بھی وجہ معلوم ہی نہیں۔لیکن یہ ویکیوم ...... اس کا کیا کروں جو روز بروز پھیلتا ہی جارہا ہے، اتنا کہ کبھی کبھار مجھے

یہ ساری کائنات اس کے اندر ایک چھوٹا سا ذرہ نظر آتا ہے۔ اس سے بھی چھوٹا۔ کسے معلوم ایسی کیفیت کو کیا کہیں؟

آج بارش برس رہی ہے۔ موسم ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ لوگوں نے کُرتے اُتار کر سُوٹ پہنے ہیں۔ مگر میرے اس ویکیوم پر کسی چیز کا اثر نہیں پڑتا۔ سردی کا نہ گرمی کا، چاہے وہ داخلی ہو یا خارجی، اس میں کوئی حرکت پیدا نہیں کر پاتی۔

جب دماغ میں کوئی جذبہ باقی نہ رہا ہو، فطرت کی یہ رنگینیاں کس کام کی۔ ویکیوم پہ کیا اثر ہو گا، یہ جیسا تھا ویسی ہی رہے گا۔ بے حس، بے جان، بے حرکت۔

آپ ہی سمجھائیے وجود کا مقصد کیا ہے؟ میں کیوں ہوں؟ میں کیوں نہیں ہوں؟

ہزاروں کتابیں۔

سینکڑوں فلسفے پڑھنے کے بعد بھی مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔ میں نے دنیا کے تمام مذاہب پرکھے۔ سارے نظریئے تلاشے۔ لیکن میرا سوال پھر بھی جواب کا متلاشی رہا۔

میں کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اسی لئے مجھے اپنا جسم، اپنی ذات، اپنا وجود بے مصرف بے مقصد اور بے جان محسوس ہوتا ہے۔ روبوٹ بھی ایک مقصد رکھتا ہے اس کو بھی کسی ضرورت کے تحت بنایا جاتا ہے جو وہ پوری بھی کرتا ہے۔ میں کیا ہوں؟ میں کیوں ہوں؟ میں کون ہوں؟ روبوٹ یا انسان؟ میں یہ کبھی بھی سمجھ نہیں پایا۔

لوگوں میں کئی طرح کی بیڑیاں پڑتی ہیں۔ کام کاج کی بیڑیاں۔ بیوی بچّوں کی بیڑیاں اور ان ہی بیڑیوں میں قید ہو کر آنکھیں بند کئے گدھے کی طرح زندگی کی راہ پر اپنے قدم گھسیٹتے ہوئے کسی انجام تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن مجھے کیا ہو گیا۔ میں بھی تو ان بیڑیوں کا قیدی ہوں، پھر بھی نہ جانے کیوں میں خود کو ان سب چیزوں سے آزاد، الگ اور تنہا محسوس کرتا ہوں۔ ان بیڑیوں کے بغیر بھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے کیا؟

صبح دفتر جانا۔ شام کو واپس آنا۔ کھانا کھانا۔ ریڈیو سننا۔ اخبار پڑھنا۔ کھان پان کی چیزوں کا حساب رکھنا، انشورنس، جی۔ پی۔ فنڈ، اِنکم ٹیکس، مکان کرایا، جینا مرنا، غم اور خوشیاں ......تمام مسائل کا بوجھ اٹھا کر بھی میں خود کو آزاد، اکیلا اور بے بندھن محسوس

کررہا ہوں جس سے میں بدحواس اور بے چین ہوتا ہوں۔ خدا کے وجود پر یقین نہ ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھار میرے دل کی گہرائی سے بے اختیار ایک پکار نکلتی ہے:

او مائے گاڈ!

چند روز پہلے میرے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ میں رات سائکل سے گر پڑا۔ اس وقت بھی میرے منہ سے یہی پکار نکلی تھی۔

او مائے گاڈ!

لیکن جب لوگوں نے مجھے اٹھایا۔ میرے دل میں کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا۔ خوف کا نہ ڈر کا اور نہ ایڈوینچر کا۔ اسپتال میں جب میں سکریننگ پلانٹ کے سامنے کھڑا ہوا تو ڈاکٹر میرے زخمی بازو کو دھیرے دھیرے کھولنے لگا۔ میں چیخ پڑا صرف جسمانی تکلیف کی وجہ سے، میرے پسینے چھوٹنے لگے۔ نہ جانے ڈاکٹر کو کیا لگا اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور پریشان ہو کر کہنے لگا۔ ''شاید فریکچر ہوا ہے''۔ مجھے ڈاکٹر کی پریشانی پر ہنسی آئی۔ وہ حیران ہو گیا اور جب مجھے ایکسرے مشین کی میز پر ڈالا گیا، میرے بازو کو پھر سے کھولا گیا۔ میرے منہ سے پھر چیخ نکل پڑی۔ ڈاکٹر ڈرتے ہوئے کہنے لگا:

''مجھے لگتا ہے کہ دو فریکچر ہیں۔''

''بس دو'' میں زور سے ہنس پڑا۔

ڈاکٹر طیش میں آکر کہنے لگا۔''جناب آپ کو یہ مذاق سوجھ رہا ہے۔ان ہڈیوں کے جڑنے میں کم سے کم تین مہینے لگ جائیں گے''۔

''صرف تین مہینے۔چھی چھی چھی۔''

میں یہ سُن کر نہ جانے کیوں مایوس ہو گیا۔

ڈاکٹر میرے سر کو سہلاتے ہوئے پوچھنے لگا۔''کہیں آپ کے سر میں بھی کوئی چوٹ تو نہیں آئی''

میں خاموش ہو گیا۔اس نادان کو کیسے سمجھاتا کہ سر میں تب چوٹ آتی جب اس میں سوچنے کا مادہ باقی ہوتا۔خالی کھوپڑی میں چوٹ آنے سے کیا ہوگا۔

ایکسرے دیکھ کر میں زیادہ ہی مایوس ہو گیا۔بازو کی ہڈیاں بالکل ٹھیک تھیں۔ڈاکٹر خاموش تھا اور وہ انگریزی میں مجھ سے کہنے لگا۔

''یو آر ویری لکی۔تھینک یور سٹارز''

ہائے......!

ایک موقعہ ملا تھا اس روزمرہ کی گردش سے الگ اور دور رہنے کا۔ مگر بدقسمتی سے وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ بازو کو پلسٹر سے قید کرنا۔ اسپتال کے صاف وشفاف اور نرم بستر پر لیٹنا کتنا رومانوی ہوتا ہے۔ جو میرے نصیب میں نہ تھا، اور یہ ناسمجھ ڈاکٹر کہتا ہے:

''رِیلی یوآر وِیری لکی۔ آے کنگریجیولیٹ یو۔''

''ہنہ۔ ایڈیٹ''

لوگوں کو کسی چیز کی کمی یا ضرورت ہوتی ہے جو وہ حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت لگاتے ہیں۔ لیکن مجھے کسی مادی چیز کی کمی نہیں۔ نہ کسی چیز کا خالی پن۔ بس ایک میرا دل خالی ہے۔ اس میں کوئی بھی جذبہ باقی نہیں ہے۔ خوف کا نہ خوشی کا، غم کا نہ رومان کا، محبت کا نہ نفرت کا۔

دانشور لوگ کہتے ہیں کہ انسان صرف دال روٹی کھا کر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ کھانا، پینا، پانی، ہوا، یہ انسانی جسم کو زندہ رکھتے ہیں لیکن انسانی کایا میں اور بھی کچھ موجود ہوتا ہے جسے کچھ الگ اور رنگارنگ غذا ملنی چاہیے۔

آج سے کچھ مدت پہلے میں اس حقیقت سے واقف تھا۔ اسی

لیے کتابیں پڑھتا تھا، افسانے لکھتا تھا، ڈرامے کھیلتا تھا، موسیقی سنتا تھا، فلمیں دیکھتا تھا، کلب جاتا تھا، محفلوں میں شرکت کرتا تھا، لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، ہنستا کھیلتا اور روتا بلکتا تھا۔ لیکن وہ میرا ماضی تھا۔ میرے حال کا اب الگ ہی طرز عمل ہے۔ مجھے یہ سب فضول، بے ہودہ اور بکواس محسوس ہوتا ہے۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے میرا دماغ خالی ہوگیا۔ افسانے لکھتے لکھتے میری اپنی زندگی کا فسانہ الجھ گیا۔ ڈراما نقل ہے، سوچ بغیر گانا وحشت پیدا کرتا ہے۔ فلمیں بے مقصد ہیں، کلب جانا بھی ریاکاری ہے۔ محفلوں میں دوستوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا کھیلنا سب ظاہر داری ہے۔ یقین مانو مجھے میرے بیوی بچوں کے ساتھ رہنا بھی تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے۔

معلوم نہیں کیوں؟

نہ جانے کیا سوچتا ہوں؟ نہیں میں کچھ نہیں سوچتا۔ کچھ بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی دل و دماغ کا یہ ویکیوم کبھی کبھار کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے، اور میں سوچتا ہوں کاش یہ ویکیوم کسی طرح بھر دیا جائے اسکو پُر کرنے کیلئے کیا چاہیے۔ کسی کی محبت؟ کسی کی شفقت؟ کسی کی ہمدردی؟ اب اگر یہ تمام چیزیں میسر ہو کر بھی یہ ویکیوم، یہ خلاء بھر نہ

پائے گا۔ تو پھر کیا کریں؟

''اف......''

میں تنگ بھی نہیں آتا۔

تنگ ہی آ جاتا۔ یہ بھی ایک جذبہ ہی ہوتا جو میرے خالی پن کو کسی نہ کسی طرح بھر دیتا۔

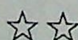
''او مائے گاڈ!''

دماغ خالی ہونا، دل خالی ہونا، اس کا کوئی علاج ہے کیا؟

بارش برس رہی ہوگی۔ ماحول بھی معطر ہوا ہوگا۔ خوشگوار ٹھنڈ بڑھ گئی ہوگی۔ اس سردی میں سفید لحاف اوڑھ کے سونا بڑا آرام دہ لگتا ہے۔ مگر وہ ان کے لیے جو رات گزرنے پر دن کے منتظر ہوں۔ لیکن جس کے نصیب میں یہ انتظار ہی نہ ہو وہ بھلا کیا کرے؟ کہاں جائے؟

''ہائے......''

میرا یہ ویکیوم، یہ خلاء کاش کسی طرح بھر جائے۔



شمشان ویراگ

(ہری کرشن کول)

ٹارزن کی بھابی چولہا جلا رہی تھی۔ پھونک مارتے مارتے اس کی سانسیں پھول گئی تھیں، لیکن گیلی لکڑیاں جلنا محال تھا۔ پورا کچن دھواں دھواں ہو چکا تھا۔

''وہ کہاں ہے؟'' ڈاکٹر اسے پوچھنے لگا۔

وہ پہلے ہی غصے میں تھی، ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ اور زیادہ آگ بگولہ ہوئی۔ اس کے چاہا کہ چولہے سے ادھ جلی لکڑی نکال کر اسے اور اس کے دوست کو زدوکوب کرے۔ ایسی سردی میں بھی یہ اس کے دیور کو نہ جانے کون سا پاٹ پڑھانے آ گیا۔ پھر سوچنے لگی اس کی کیا خطا، اپنا

ہی دیو رنکما ہے۔

''ابھی سویا ہی ہے کیا؟'' ڈاکٹر نے اس کی خاموشی میں بھی جواب حاصل کیا اور سیڑھیوں سے اوپر ٹارزن کے کمرے کی طرف چڑھنے لگا۔

''اُٹھو سالے، پیڈرو کا کام تمام ہوگیا!'' کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ چلّا کر کہنے لگا۔

ٹارزن بستر سے ایک دم کھڑا ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا ہے، لیکن اتنا یقین ہوگیا کہ کچھ تو بُرا ہوا۔

''اسکی ماں مرگئی'' ڈاکٹر اسکے سرہانے بیٹھ کر بولا۔

ٹارزن نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھولی جہاں سے دھیمی روشنی کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹارزن ابھی لحاف کے اندر ہی تھا۔ لحاف پر پرانی کمبل تھی اور سرہانہ بغیر غلاف کے جو نہ جانے کتنے برسوں سے ٹارزن کے بالوں کا تیل چوس رہا تھا۔ دائیں طرف رسالوں سے کاٹی ہوئی فلمی پریوں کی رنگین تصویریں اور بائیں طرف سگریٹ پیکٹ جس میں چند سگریٹوں کے علاوہ ایک آدھا پھونکا ہوا سگریٹ بھی موجود تھا۔

''کب؟'' اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''سنا ہے آج سویرے۔'' ڈاکٹر نے سگریٹ پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر کہا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے وہ رات میں ہی چل بسی ہوگی اور اُس سالے کو صبح تک پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ اپنی ہی مستی میں کسی کے یہاں مست تھا۔''

''بڑا کمینہ ہے! ہمارے بغیر ہی؟''

''مجھے بھی پتہ نہیں چلا۔ سنا ہے پٹواری کے گھر میں اس کے بھاگ پھوٹے تھے۔ کوئی دوسرے ہی لوگ ساتھ تھے۔''

''ارے یہ کمبخت ذلیل ہو جائے گا۔ اسکو وہاں کا راستہ کس نے دکھایا۔ وہاں دن رات جوّا چلتا رہتا ہے۔...... ذرا ایک سگریٹ مجھے بھی دے۔''

ڈاکٹر نے اسکے سگریٹ پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر ٹارزن کو دیا۔

''ذرا کانگڑی بھی تھما دے۔''

ڈاکٹر نے اس کی طرف کانگڑی بڑھائی۔ ٹارزن نے کانگڑی میں جلتے کوئلے سے سگریٹ سلگایا اور پھر کانگڑی کو اپنی لحاف

کے اندر ٹانگوں کے نیچے رکھا۔ ''اب تو وہ آزاد ہے۔ لے دے کے بس اک ماں بچی تھی اسکی، وہ بھی پرلوک سدھار گئی۔ کھیلنے دے اب اپنا گھر بار بیچ کے جُوا۔

''ورنہ کیا نہیں کھیلتا۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن اب ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''اب اسکے کون سے رشتہ دار ہیں جو اسکی ماں کو شمشان تک لے جائیں گے۔ اٹھو کسو کمر اور چلو۔''

''ہم تو ہمیشہ کمر کسے ہی رہتے ہیں۔ بتا تو سہی کس کس کے ماں باپ کو کندھا دینا ہے۔''

ٹارزن نے بستر سے نکل کر کپڑے پہنے۔ طاق سے کنگا اٹھا کر بال سنوارے۔ گلو بند باندھا۔ سرہانے سے چند جرابے نکال کر پہن لیے اور کانگڑی ڈاکٹر کو دے کے کہنے لگا۔ ''چلو ہم تیار ہیں''۔

''ارے رکو پہلے سگریٹ تو ختم کرنے دو۔ ڈاکٹر نے کانگڑی کے گرم کوئلے ہاتھ سے پھیرے اور پھیرن سے ہاتھ صاف کیا۔''

''ہاں کیوں نہیں! جب ابھی تک بڑھیا کو دیر نہیں ہوئی تھی تو اب ہمارے سگریٹ پینے سے کہاں ہوگی۔'' ٹارزن کھڑکی کے طاق

پر رات کو رکھی ہوئی کانگڑی اٹھا کر جھٹکنے لگا۔ جھٹکنے سے اس میں بچا کچا ٹھنڈا پڑا کوئلہ اوپر کی طرف آیا۔ ڈاکٹر کی کانگڑی سے ایک انگارا اس میں ڈال کر پھونکنے لگا۔

''مزید کوئلے نہیں ڈالو گے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

باہر نان وائی کے بھٹے سے تھوڑا سا کوئلہ ڈالیں گے۔ اب صبح صبح کانگڑی کے لیے کسی کی کیا منت لینا۔

''اچھا اسکور کیا ہوا؟''

''کس سالے کو پتہ؟''

''اگر آج کے دن چھے وکٹیں لیں گے تو جیت جائیں گے۔''

''او۔ جیتیں گے! ڈاکٹر نے ٹھینگا دکھا کر کہا۔ ابھی تک بڑا جیتتے آئے ہیں جواب یہ میچ جیتیں گے۔''

دونوں کمرے سے نکلے لیکن ڈاکٹر فوراً واپس مڑا اور سگریٹ پیکٹ سے آدھا جلا ہوا سگریٹ نکال کر اپنے کان کے اوپر پھنسا کے رکھا۔

''چھوڑ کیوں دیں گے''۔ اس نے ٹارزن سے کہا۔

دونوں دھیرے دھیرے سیڑھیوں سے اتر کر گلی سے نکلنے لگے۔

ٹارزن کی بھابی باہر دروازے پہ کھڑی تھی۔ جوں ہی یہ دونوں دہلیز سے نیچے اترے ٹارزن کی بھابی بڑ بڑانے لگی۔ ''اسکو کا فکر، صبح ہووے ناتے ای چل دیوے ببوا بن کے، تیل مل کے۔ بتّہ تھالا تھالا کھاوے، ای سوچتا ناہی کہاں سے آوے۔۔۔ای سب ہمی جانے۔۔۔۔''

''ارے یہ عجب چڑیا آپکے بھائی کو کہاں سے ملی؟'' چلتے چلتے ڈاکٹر نے ٹارزن سے پوچھا۔

''چلو کم سے کم اسے یہ تو ملی ، ہمارے بھاگ میں ایسا بھی نہیں ہوگا۔''

''بھاگ میں آپکے نہیں ہوگا، میرے تو ہے۔ مجھے تو ہے 'لو'۔''

ٹارزن سر سے پاؤں تک ڈاکٹر کا جائزہ لے کر کہنے لگا ،'لو' اور تجھے۔۔ ممکن نہیں۔

بازار پہنچ کر ٹارزن نے نان وائی سے کانگڑی میں کوئلے بھروائیے۔ دکاندار سے تین سگریٹ پیکٹ ادھار لیے اور ڈاکٹر سے کہنے لگا۔ ''اب میں پورے شہر کو شمشان لے جاسکتا ہوں۔ اب میں

چست ہو گیا۔''

''نان وائی سے اسکور پوچھا کیا؟''

''اسکے ریڈیو کی بیٹری ختم ہو گئی تھی''۔اس نے سگریٹ پیکٹ سے دو سگریٹ نکال کر ایک خود سلگایا اور دوسرا ڈاکٹر کو دیا۔ڈاکٹر نے کان پر رکھے آدھے سگریٹ کو اب پھینک دیا۔

''میں نے سوچا تھا آج اتوار کو کمنٹری سنیں گے۔کسے خبر تھی یہ مصیبت آج ہی دیکھنی پڑے گی۔''

''کب تک یہ کام نپٹے گا؟''

''ایک یا دو بجے تک۔''

''کمنٹری سنیں یا پھر۔۔۔!''ٹارزن کو اچانک کوئی خیال آیا اور ڈاکٹر سے پوچھنے لگا۔

''اوپر کیسی ہے؟''

''بکواس۔''

''نیچے؟''

''ارے وہی سر درد ابھی بھی۔''

''اچھا تو وہاں؟''

''پتہ نہیں کل ہی لگی ہے۔''

''اُس پار؟''

''سنا ہے اچھی ہے۔''

''اگر ایک بجے سے پہلے کام پورا ہوا تو پھر وہیں جائیں گے۔ وہیں کمنٹری بھی سنیں گے۔''

''آپ کو لگتا ہے کہ یہ جیت جائیں گے؟''

''اگر جیتیں گے تو عیش کراؤں گا تیری قسم۔''



پیڈرو نے جب دیکھا کہ ماں پرلوک سدھار گئی تو وہ رویا نہیں بلکہ چپکے سے پہلوان کے گھر گیا۔ پہلوان نے پہلے سیٹھ کو خبر دی اور پھر پنڈت کے پاس چلا گیا۔ راستے میں ڈاکٹر کا بھائی ملا تو اسے بھی بتا دیا۔ سیٹھ پچاس روپے لے کر سیدھے 'مریتو ساگری ٹرسٹ' پر کریا کرم کا سامان اور کفن لینے چلا گیا۔ جب وہ سامان لے کر آ گیا تب پیڈرو نے رونا بلکنا شروع کیا جس کی وجہ سے محلے کے چند لوگ وہاں پہ جمع ہو گئے۔

پیڈرو کا ممیرے چچا کے سوا شہر میں کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ وہ بھی پانچ

میل دور رہتا تھا۔ اس لیے اسے کوئی خبر نہیں دی گئی۔ اگر خبر بھیج بھی دیتا پھر بھی وہ نہیں آتا، پیڈؔ رو کو یہ پورا یقین تھا۔ پیڈؔ رو کو اپنے ہر رشتہ دار سے نفرت تھی اب جو کچھ رشتہ کسی سے باقی تھا وہ اسکی ماں کی وجہ سے۔ ماں چل بسی تو سارے رشتے بھی چل بسے۔ اب وہ آزاد ہوگیا، ہر فکر سے آزاد، ہر طریقے سے آزاد۔ اب اسے کسی رشتہ دار کو نمسکار کرنے کی مجبوری بھی نہیں تھی، نہ ہر سال باپ کا شراد کرنا ضروری اور نہ ہر روز گھر آنا۔ اب وہ وہی سب کرے گا جو اس کا دل چاہے گا۔ آج سے وہ اپنے آپ کا مالک ہے اپنے گھر کا اپنی دنیا کا۔

تھوڑی دیر بعد پہلوانؔ پنڈت کو لے آیا۔ محلے کی ایک عورت نے پیڈؔ رو کی ماں کو انتم اسنان دینے کی خاطر پانی گرم کرنے کے لیے ایک بڑے پتیلے کو چولہے پہ رکھا اور دوسری طرف آنگن کے ایک حصّے کو صاف کیا گیا جہاں پر پیڈؔ رو اور پنڈت کرّیا کرم کی رسم پوری کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ وہ ابھی زُنار نکال ہی رہا تھا کہ ٹارزنؔ اور ڈاکٹر آ پہنچے۔ ٹارزنؔ سیدھے پیڈؔ رو کے پاس جا کے اسکے کان میں کہنے لگا۔

''پیسے ہیں؟''

''ہاں ہیں۔''

''سچ کہنا تجھے ماں کے مرنے کی قسم۔''

''ہاں یار ماں کے مرنے کی قسم میرے پاس ہیں۔''

''چلو پھر ٹھیک ہے۔''

وہ آنگن کے ایک طرف پتھر پہ بیٹھ گیا۔ جوں ہی میّت کو اسنان کے لیے لے جا رہے تھے وہ کھڑا ہو کے پہلوانؔ سے کہنے لگا۔ '' آخر کار یہ بڑی خود غرض نکلی۔ دیکھ تو خود گرم پانی سے نہا رہی ہے لیکن بے چارے پیڈرؔو کو اس چلئے کلان کی ایسی سردی میں ٹھنڈے پانی سے نہلوائے گی۔''

آخری اسنان دے کر میّت کو کفن اوڑھ کے ارتھی پہ ڈالا گیا۔ ٹارزنؔ اور سیٹھ نے ارتھی کو آگے سے کندھا دیا، ڈاکٹر پیچھے ایک طرف کندھا دینے لگا اور دوسری طرف پہلوان نے ہاتھ بڑھا کر کندھا دینا چاہا تو ڈاکٹر اسے کہنے لگا '' پہلوؔ! تو ہاتھ مت لگا میّت ناپاک ہو جائے گی۔''

'' ارے اگر اسے پتہ چلے گا کہ مسلمان کندھا دے رہا ہے تو یہ ارتھی سے چھلانگ مارے گی۔'' ٹارزنؔ نے کہا۔

''چلو دے دو اسکو تم لوگ ہی سواری'' پہلوانؔ پیچھے ہٹ کر کہنے لگا۔ ''مگر' داہ کرمی' تو مسلمان ہی ہوتا ہے۔''

''ارے تجھے کون سی مجبوری ہے۔'' پہلوانؔ نے کہا۔

آخرکار ایک ہمسایہ لڑکے نے چوتھی طرف کندھا دیا اور شمشان کی طرف میّت کی انتم یاترا شروع ہوئی۔

آگے آگے پیڈرؔو 'گھڑا' لیے اور پنڈت چادر اوڑھے چل رہے تھے۔ پنڈت کو ایسے کڑاکے کی سردی میں صبح سویرے گھر سے نکلنا بڑا دشوار ہوا تھا۔ وہ اس سوچ میں تھا کہ وکیل ایسی سردی میں آنے سے انکار کرسکتا ہے، ڈاکٹر بھی انکار کرسکتا ہے۔ لیکن ہم انکار نہیں کرسکتے۔ لعنت ہو ہمارے اس کام پر۔ اتنا سب کرنے کے باوجود بھی کیا پتہ اس نکمے کے جیب سے پھر کچھ نکلے گا بھی یا نہیں۔

پیڈرؔو اور پنڈت کے پیچھے ٹارزنؔ، ڈاکٹر، سیٹھؔ اور ہمسایہ لڑکا ارتھی لیے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے پہلوانؔ اور محلے کے چند لوگ جو سو دوسو میٹر چلنے کے بعد اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔

گھڑا ہاتھ میں لیے پیڈرؔو آگے پیچھے دھیان دئے بغیر چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد اب

وہ آزاد ہو گیا۔ لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ وہ آزاد نہیں ہوا...... بلکہ اسکی وہ ڈور ٹوٹ گئی جو اسے کنارے سے باندھے رکھی تھی۔ اب وہ دنیا کے سیلاب میں بہہ جائے گا یا کسی جگہ ڈوب جائے گا یا کسی جگہ پھنس کر وہیں سڑ جائے گا۔ ماں اسے بُرا بھلا سناتی تھی لیکن اسکے لیے پرارتھنا بھی کرتی تھی۔ گھر کا خرچہ مانگ مانگ کر اسکا جینا حرام کرتی تھی لیکن مہینے کے آخر میں اسے سگریٹ کے لیے خرچہ بھی دیتی تھی۔ اگر پیڈرو سے روٹھی رہتی تھی لیکن کبھی کبھی سینے سے بھی لگاتی تھی۔ اب نہ ہی اس سے کوئی روٹھے گا اور نہ ہی کسی کو اسکی یاد آئے گی۔ نہ اب اسکا کوئی مرے گا اور نہ اسکے مرنے پہ کسی کو دکھ ہوگا۔ وہ اب اس کائنات میں اکیلا ہے اور یہ کائنات بڑی کرخت ہے۔

اچانک وہ پیچھے کی طرف مڑا اور اسکے پیروں تلے زمین کھسک گئی وہ اس وقت سچ میں گھڑا لیے راہ میں اکیلا چل رہا تھا۔ نہ پنڈت کہیں تھا اور نہ ارتھی۔ یہ کون سی آفت آئی۔ اس کے ہاتھ سے گھڑا چھوٹنے لگا تو وہ دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑ بیٹھا۔ وہ کہیں سپنا تو نہیں دیکھ رہا یا پھر یہ بھگوان کی کوئی مایا ہے۔ آخر کار پنڈت کو ایک دکان کے قریب سگریٹ سلگاتے دیکھا اور اسکے دل کی دھڑکن تھوڑی

قرار میں آنے لگی۔ لیکن باقی سب؟ کہاں ہیں؟ ماں کہاں ہے؟ وہ دھرتی میں سما گئے یا آسمان نگل گیا؟ پنڈت سگریٹ سلگا کے آیا اور پیڈرو سے کہنے لگا:

''تیرے ساتھ کچھ برا ہونے والا ہے۔ ان کمبختوں کے پیر کھسک گئے ہونگے اور ارتھی گر گئی ہوگی۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

پیڈرو کو پہلے ہی شک تھا کہ اسکے ساتھ کچھ برا ہونے والا ہے، پنڈت نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی۔ لیکن ابھی معاملہ یہ تھا کہ ارتھی اور ارتھی والے کہاں گئے۔ اگر گر بھی گئے ہوں گے لیکن غائب تو نہیں ہوئے ہوں گے۔ کچھ تو ہوا ہے! پنڈت زور زور سے پڑھ رہا تھا ''میرے پاپوں کو دھو دے، ہے شوشمبھو، ہے مہادیو شمبھو۔'' جوت جلی گھڑے کی آنچ دھیمی ہوگئی تھی جس سے اب دھوئیں کی لکیر نکل رہی تھی۔ پیڈرو حیران و پریشان بھی تھا اور ڈرا ہوا بھی۔ اسکی دھڑکنیں بڑھ رہی تھیں۔ آخر کار اسے دور سے ارتھی کا آکار نظر آیا اور دھیرے دھیرے اسکی ماں کی ارتھی اسکے قریب آ پہنچی۔

''تین گر گئے'' قریب پہنچ کر ٹارزن چلایا۔

''اوہ! تین بار میّت گری! شِو شِو شِو۔'' پنڈت کو جھٹکا لگا۔

''ارے نہیں ۔میرے فائٹر بولر نے تین وِکٹ چٹکائے ۔''

''چپ رہو'' سیٹھ غصے سے اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

پہلوانؔ پیڈروؔ سے کہنے لگا'' ارے پان کی دکان کے قریب ٹارزنؔ اچانک رک گیا۔ کہنے لگا کمنٹری سنوں گا ۔ہم نے منتیں کیں ۔پان والے نے بھی سماجت کی لیکن یہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہاں پر ہم تقریباً دس منٹ ارتھی لے کر کھڑے رہے ۔ٹریفک بھی جام ہوا۔

'' ارے جب پچھلے ستھر سالوں سے اسے دیر نہ ہوئی تھی ،اب میرے ہی دس منٹ سے کونسی آفت آتی ۔'' ٹارزنؔ نے اپنی صفائی پیش کی ۔

'' اسے کہو اپنا منہ بند رکھے۔'' سیٹھؔ کا پورا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔'' اگر اس نے اپنا منہ بند نہ کیا میں ارتھی کو یہیں چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔''

پنڈت پیڈروؔ پر غصہ نکالنے لگا ۔''تم لوگ انسان ہو یا جانور۔میں نے قسم کھائی دوبارہ کبھی ...... ویسے اب کون مرے گا تیرا۔''

شمشان گھاٹ پہنچ کر ارتھی کو نیچے اتارا گیا، لکڑیاں لگائی گئیں۔ پنڈت اور پیڈ رو آخری رسومات ادا کرنے لگے۔ ٹارزن نے تھکن دور کرنے کے لیے انگڑائی لی اور ساتھیوں سے کہنے لگا۔

''تم لوگوں نے سنا؟ ڈاکٹر کو کسی کے ساتھ 'لو' ہے۔''

پہلوان اور سیٹھ زور زور سے ہنسنے لگے۔

''کس کے ساتھ؟'' پہلوان نے پوچھا۔

''میں بتاؤں گا'' ٹارزن بیچ میں بول پڑا۔''اس کو اپنی افسر ن سے لو ہے۔

ہمسایہ لڑکا عمر میں ان سب سے چھوٹا تھا، وہ شرما گیا۔

''یہ اسکے گھر کا سارا کام کرتا ہے، کپڑوں کو استری کرتا ہے، دھوتیاں تہہ کرتا ہے، بازار سے سودا لا کے دیتا ہے ...... کچھ حاصل بھی ہوتا ہے یا خالی اپنا ہی وقت برباد کرتے ہو۔''

ڈاکٹر اسے ڈانٹنے لگا۔''ابھی تیرے سارے دانت توڑ دوں گا۔ بکواس بند کرو وہ میری ماں ہے۔''

''اس کو کیوں تانے دے رہا ہے۔ تو بھی تو خود پریس مالک کے گھر جاتا ہے۔'' پہلوان کہنے لگا۔

''میری جائے گی جوتی۔ ان کے گھر جانے سے تھوڑی مجھے منیجر بنائے گا۔ ہم خوددار لوگ ہیں ہم تمہاری طرح بخشش نامہ لکھ کے دینے والے نہیں ہیں۔''

''اس نے بخشش نامہ لکھ کے دیا؟ لیڈری چھوڑ دی؟'' ڈاکٹر پوچھنے لگا۔

''چھوڑتا نہیں اور کیا کرتا۔'' ٹارزنؔ نے جواب دیا۔ پولیس والوں نے پوسٹر چپکانے کے معاملے پر حراست میں لیا۔ لیکن محلے کے لوگوں اور رشتہ داروں نے افواہ پھیلائی کہ چوری کرتے پکڑا گیا۔ گھر سے چوری کا مال برآمد ہوا۔''

''معافی نامہ لکھ کے نہ دیتا اور کیا کرتا۔'' پہلوان بول پڑا۔

''معافی نامہ نہیں بلکہ بخشش نامہ۔'' ڈاکٹر نے غلطی درست کی۔ سیٹھؔ ہنسنے لگا۔

''اورتان سین مہاراج، تجھے کب ریڈیو اسٹیشن جانا ہے گانے کے لیے؟'' ٹارزنؔ اب سیٹھؔ سے پوچھنے لگا۔

''دیکھو میرے ساتھ مذاق مت کرو۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔'' سیٹھؔ کو برا لگا۔ ٹارزنؔ، ڈاکٹر اور پہلوانؔ زور زور سے ہنسنے

لگے۔

جلتی ہوئی چتا اب دھیمی پڑنے لگی تھی۔ لو کم ہوگئی تھی اور کوئلہ ٹوٹنے کی آوازیں بڑھ رہی تھیں۔ پیڈرو سر جھکائے کسی گہری سوچ میں تھا۔

''چلو اب چلتے ہیں۔'' سیٹھ نے پیڈرو کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہاں چلو۔'' پیڈرو کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

''ارے ابھی چتا کی اچھی خاصی گرمی تھی۔'' ڈاکٹر کہنے لگا۔

''یہ بھی مصیبت ہے۔ چلئے کلان بھی ختم ہونے کو آیا لیکن برف ابھی بھی نہیں گری۔'' پہلوان کہنے لگا۔'' برف گرتی تو سردی میں راحت ہوتی۔''

''ٹارزن کہاں ہے؟'' پیڈرو پوچھنے لگا۔ سبھی دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ لیکن ٹارزن کہیں نظر نہیں آیا۔

''وہ چلا گیا ہوگا۔'' سیٹھ کہنے لگا۔ سالے کو کمنٹری جو سننی تھی جیسے اسکے بہنوئی کھیل رہے ہیں۔''

''کبھی بلا ہاتھ میں بھی نہیں پکڑا۔ یہ بھی نہیں خبر کہ مڈ آن کسے

کہتے ہیں اور سلی ٹڈ آن کہاں پر ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم سب کو چھوڑ کے بھاگ گیا۔'' پہلوان چڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''کمنٹری سننے نہیں گیا ہوگا بلکہ وہ فلم دیکھنے گیا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے اپنا اندازہ لگایا۔ ''صبح سے ہی اسکے من میں یہ خیال منڈلا رہا تھا۔''

پیڈرو، ڈاکٹر اور سیٹھ چتا کو نمسکار کر کے اب چلنے لگے۔ ایک دو قدم ہی آگے بڑے کہ پہلوان ایک دم سے چیخ پڑا۔ ''وہ رہا سالا۔''

ٹارزن چنار کے پیچھے کھڑا چتا کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''ہمیں لگا شاید تم پہلے ہی رفو چکر ہو گئے۔'' ڈاکٹر کہنے لگا۔

ٹارزن خاموش چتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''چلو اب چلنا نہیں ہے کیا؟'' پہلوان پوچھنے لگا۔

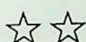
ٹارزن نے اسے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

''چلو اب یہاں رکنے سے کیا حاصل ہوگا۔'' پیڈرو ٹارزن سے کہنے لگا۔

اسکی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ٹارزن پیڈرو کو گلے لگا کر

پھوٹ پھوٹ کے روتے ہوئے کہنے لگا: ''چھے سال پہلے میں بھی اپنی ماں کو یہاں لے آیا اور یہیں پہ اسکو بھی راکھ کیا۔'' دونوں عورتوں کی طرح دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔

ڈاکٹر اور پہلوان حیران ہو کے رہ گئے لیکن سیٹھ نے انہیں سمجھایا۔ ''اسی کو کہتے ہیں شمشان ویراگ، ان سے کچھ مت کہو رونے دو انہیں۔''



پھاٹک

(امین کامل)

دوارکا ناتھ اور میری کافی پرانی جان پہچان ہے۔ میرے والد اوران کے بیچ دس سال پرانا دوستانہ تھا۔ دوستی بھی ایسی کہ دو جسم ایک جان۔ جب تک میرے والد زندہ تھے دوارکا ناتھ پندرہ بیس دن بعد ان سے ملنے ضرور آتے تھے۔ چاہے ان کی تھانہ داری میلوں دور ہی کیوں نہ ہوتی۔ میرے والد سے دوستی ہونے کی وجہ سے وہ میری بھی بہت عزت کرتے اور مجھے عزیز بھی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے تھانے کی کوئی بھی بات مجھ سے نہیں چھپاتے۔ وہ معمولی واقعات سے لے کر انتہائی راز کی باتیں تک مجھ سے کہتے ہیں۔

چند روز پہلے میں اپنے نجی کام سے ان سے ملنے گیا۔ اس سے کچھ دن پہلے شہر میں کوئی سیاسی اتھل پتھل مچی تھی۔ چند لوگوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کر کے بازار میں جمع ہو کر حکومت کے

خلاف مظاہرہ کیا تھا۔ باتوں باتوں میں دوارکا ناتھ سے میں پوچھنے لگا۔ ''مظاہرہ کرنے والوں کو گرفتار کرنا آپ کا فرض تھا۔ وہ تو ٹھیک تھا لیکن یہ کتنی ناانصافی ہے کہ آپ گھروں میں گھس کر بے گناہوں کو پکڑ کر تھانے میں قید کر دیں۔ میں ایسے دس بیس افراد کو نجی طور پر جانتا ہوں جو ایسے بکھیڑوں میں کبھی حصہ لیتے ہی نہیں۔ آخر اس طرح اندھا دھند لاٹھی چارج کرنے سے آپ لوگ کیا حاصل کرتے ہو۔''

دوارکا ناتھ نے میری ان باتوں سے اپنے ہونٹوں پر ذرا سی مسکراہٹ لائی اور پھر جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک خود لیا اور دوسرا میری طرف بڑھا کر کہنے لگا۔ ''تو آپ کو اس سوال کا جواب چاہیے۔ ٹھیک ہے۔ سن لیجئے۔''

دوارکا ناتھ نے جو کچھ مجھ سے کہا وہ سن کر مجھے ایک پرانا قصہ یاد آیا۔ کم از کم چھبیس سال پرانا۔ ان دنوں کشمیر پر مہاراجہ ہری سنگھ کا راج تھا، جسے اب ختم ہوئے سنتالیس دس ستاون ایک اٹھاون پورے گیارہ سال ہو گئے۔

قصہ یہ تھا کہ ایک دن دس بجے میں کالج جا رہا تھا۔ راستے میں دیکھا کہ پولیس والے چند گائیں گلے میں رسی ڈالے گھسیٹ کے

لے جا رہے تھے۔ ان پولیس والوں کے پیچھے پیچھے کچھ عورتیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے روتے بلکتے اور چھاتی پیٹ پیٹ کے آرہے تھے۔ ایک پولیس والا ان عورتوں سے کہہ رہا تھا۔ ''یا تو آپ سب کو ہماری بات سمجھ میں نہیں آرہی یا پھر ہم پر بھروسہ نہیں۔''

''سنیے ہم آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔'' عورتیں رحم مانگ کر کہہ رہی تھیں۔ خدا کے لیے چھوڑ دیجئے ان گائیوں کو۔ مہربانی ہوگی۔''

''کیا مصیبت ہے'' دوسرا پولیس والا طیش میں آکر کہہ رہا تھا۔ ''شاید تمہیں یقین نہیں آرہا کہ ہم تم کو دس دس آنے دیں گے۔'' پھر وہ پہلے پولیس والے سے کہنے لگا۔ ''ارے ان کے ہاتھ میں پیسے تھما دو تاکہ ان کو بھروسہ ہو۔''

پہلا پولیس والا انہیں پیسے دینے لگا لیکن عورتوں نے یہ پیسے نہیں لیے۔ وہ بس منتیں کر کر کے انہیں گائیوں کو چھوڑنے کی دہائی دے رہی تھیں۔

میں حیران ہو کے سوچ رہا تھا کہ اگر یہ پولیس والے قانون کے مطابق ان گائیوں کو آوارہ گھومنے پر پھاٹک میں بند کرنے کے

لیے لے جا رہے تھے، پھر یہ بحث و قسمیں کیوں؟ اور یہ پولیس والے انہیں پیسے کیوں تھما رہے ہیں۔ میں قریب جا کے انہیں پوچھنے لگا۔

''جناب یہ معاملہ کیا ہے؟ آپ ان گائیوں کو کہاں لے جا رہے ہو؟''

''جی معاملہ کچھ بھی نہیں۔'' ایک پولیس والے نے جواب دیا۔ ''ہمیں ان گائیوں کو پھاٹک میں بند کرنا ہے''۔ اب ہم ان کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ ہم انہیں ایک طرف پھاٹک میں بند کریں گے اور آپ دوسری طرف انہیں نکال لینا۔ ان کو وہاں دس آنے تاوان بھرنے پڑیں گے اور وہ دس آنے انہیں ہم خود دے رہے ہیں۔ بات معمولی سی ہے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ذرا آپ ہی انہیں سمجھا دیجئے اور یہ رہے دس آنے آپ ہی ان کے حوالے کیجئے۔''

میں نے نہ پیسے لیے اور نہ ہی ان عورتوں کو سمجھایا۔ کیونکہ ابھی یہ معاملہ میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ ان عورتوں کی گائیں اگر پھاٹک میں بند کی جا رہی ہیں لیکن پولیس والے اپنی جیب سے تاوان کیوں دے رہے ہیں۔ ان کی کیا مجبوری ہے۔ اگر ان کی

غربت پر ترس آرہا ہے، ویسے ممکن تو نہیں، پھر ان گائیوں کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ میں ایک بار پھر ان سے پوچھنے لگا۔

''آپ کا کہنا تو ٹھیک ہے۔ لیکن پھر آپ ان کے بدلے پیسے کیوں دے رہے ہو؟''

''اجی کیا کہیں۔ ایک پولیس والے نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔'' جب مہاراجہ صاحب دہلی سے ہوائی جہاز میں یہاں آئے۔ آپ جانتے ہو! ہوائی اڈے سے گپکار شاہی محل تک کا راستہ بند کیا گیا تھا جو کہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ رکھنا پڑتا ہے جب مہاراجہ صاحب کو کہیں آنا جانا ہوتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا پھر اس راستے سے مکھی کو بھی اڑنے کی اجازت نہیں ہوتی جب تک مہاراجہ کی سواری وہاں سے گزر نہ جائے۔ کل بھی اس سڑک پر پولیس کا پہرا لگا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے جب مہاراجہ کی سواری ریشم کارخانے کے قریب پہنچ گئی تو اسی وقت اچانک ایک گلی سے دو گائیں دوڑتی ہوئی نکلیں اور سیدھے سڑک پار کرنے لگیں۔ پولیس والوں نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن ان کو بھگانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ مہاراجہ کو اپنی سواری روکنی پڑی جب تک یہ گائیں رستے سے ہٹ نہ گئیں۔ انہوں

نے اسی وقت ڈی۔آئی۔ جی پولیس کو حکم دیا کہ ان سب پولیس والوں کو معطل کر دیا جائے جو اس وقت وہاں ڈیوٹی پر تعینات تھے۔ اس کے علاوہ ڈی۔ آئی۔ جی نے حکم دیا کہ جہاں کہیں بھی آوارہ گائے ملے اس کو پھاٹک میں بند کر دیا جائے۔ جو بھی اس میں لاپروائی برتے گا وہ بھی معطل کیا جائے۔

اب آپ ہی بتائے ہم بھی بال بچے والے ہیں۔ ہم خود اپنی روزی روٹی پر لات تو نہیں مار سکتے۔ ہمیں بھی اپنی ڈیوٹی پر کاربند رہنے کا ثبوت تو دینا ہے۔ جب ہمیں کوئی آوارہ گائے نظر نہیں آئی جس کو ہم پھاٹک لے جاتے، تو ہم نے ان کے گاؤ خانوں سے یہ گائیں نکالیں پھاٹک لے جانے کے لئے۔ رہی بات ان کو وہاں سے چھڑا لے آنے کی، تو ان کو وہاں دس آنے تاوان دینے پڑیں گے جو ہم انہیں اپنی جیب سے دے رہے ہیں۔ اب ہم نے ان سے کیا غلط کہا۔''

مجھے اس دن بھی ہنسی آئی تھی اور پرسوں بھی جب دوراکا ناتھ نے میری بات کا ایسا ہی کچھ جواب دیا۔



ہمزاد

(ہردے کول بھارتی)

میں آج بھی کل ہی کی طرح بس کا انتظار کر رہا تھا، اور کل بھی مجھے پرسوں کی طرح ہی انتظار تھا۔ شاید آج کی طرح کل بھی مجھے یہی انتظار ہوگا۔ بس ہر روز آتی ہے۔ نہ جانے کتنے چکر لگاتی ہے۔ میں بھی باقاعدہ طور اس کے انتظار میں ہوتا ہوں۔ لیکن کبھی وہ آتی ہے اور میں پیچھے رہ جاتا ہوں اور کبھی میں پہنچتا ہوں اور وہ نکل چکی ہوتی ہے۔

اب ہر روز کی طرح آج بھی وہ کبوتر آئے گا اور سڑک کے اس پار بنک کی بارہ منزلہ عمارت کے اس روشن دان پر بیٹھے گا۔ پھر روشن

دان کے اس شیشے پر چونچ مارنا شروع کرے گا۔ ہر روز وہ یہی دھوکا کھاتا ہے کہ یہ شیشہ نہیں ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ روشن دان بنا شیشے کے ہے اور وہ پار جا سکتا ہے لیکن ہر روز اس کی چونچ شیشے سے پانچ آٹھ بار ٹکراتی ہے اور ٹِک ٹِک ٹِک کرتے کرتے جب اس کی چونچ میں درد پیدا ہوتا ہے تو مایوس ہو کے روشن دان کے ایک کونے میں سمٹ کر خاموش بیٹھ جاتا ہے۔ اس کبوتر کی گردن پر سیاہ رنگ کا دائرہ بنا ہے۔ قدرت نے اسے سیاہ لکیر کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے۔ گلے کی سیاہ لکیر ہوتی ہی ہے کچھ کر گزرنے کی نشانی۔ پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ کچھ کر نہ بیٹھے۔ میری بس ابھی بھی نہیں آئی۔

آج وہ کبوتر بھی کہیں نظر نہیں آ رہا۔ شاید وہ بھی آج اس روشن دان کو بھول گیا ہے۔ بنک کی بارہ منزلہ عمارت کے باہر جتنا اجالا ہے اتنا ہی اندھیرا اس روشن دان کے اندر ہے۔ روشن دان کے چھوٹے سے شیشے سے صاف نظر آ رہا ہے کہ اندر ساری دنیا کا اندھیرا ٹھونس کر بند رکھا گیا ہے۔ شاید بنک والوں نے یہ لاکر (locker) اپنا اپنا اندھیرا محفوظ رکھنے کیلئے ہی بنائے ہیں۔ ویسے بھی یہ بڑا قیمتی اور اسکے اوصاف بھی کئی ہیں۔ بنک والے اگر

ایسے محفوظ لاکر نہ بناتے تو لوٹ کھسوٹ ہو جاتا اس اندھیرے کا۔
ویسے بھی لوگ یہاں اس کے کچھ کم بھوکے بھی نہیں۔
بس ابھی بھی نظر نہیں آ رہی۔

لگتا ہے کبوتر کو بھی آج آنے میں دیر ہو رہی ہے۔ ابھی تک تو آ چکا ہوتا تھا۔ کہیں کسی مصیبت میں نا پڑا ہو۔ وہ تو پیدا ہی ہوا ہے سیاہ لکیر کے ساتھ۔

بنک کی عمارت کے باہر بہت زیادہ روشنی ہے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ روشن دان کے شیشے کے پار کا اندھیرا باہر آنے کی کوشش کر رہا ہے یا پھر باہر کی روشنی اندھیرے کے لاکروں میں گھس کر محفوظ ہونا چاہتی ہے۔ اس دوطرفہ جنگ میں نہ جانے کبوتر کیوں بیچ میں آ رہا ہے سیاہ لکیر چڑھا کر۔

آج کہیں نظر نہیں آ رہا۔
بس بھی ابھی نہیں آئی۔

''زندہ باد............''

''مردہ باد............''

''ہائے ہائے............''

ابھی یہ جلسہ بہت دور ہے۔ شاید تب تک بس آ جائے گی۔ جلسہ یہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں نکلنا چاہتا ہوں۔ پھر جو ہوتا سو ہوتا۔ پھر لاٹھی چارج ہوتا' گولی چلتی یا پھر کرفیو لگ جاتا .... جلسہ ہوتا یا پھر پولیس کو اپنے بچاؤ میں گولی چلانی پڑتی۔

''ہم کریں گے۔ ہم کریں گے............''

''واپس جاو۔ واپس جاو............''

''مردہ باد۔ مردہ باد............''

''ہائے ہائے۔ ہائے ہائے............''

کہیں سیاہ لکیر والا کبوتر اسی جلسے میں پھنس نہ گیا ہو۔ بس تب تک نہیں آنی چاہیے جب تک جلسہ نہ نکلے۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کون اس کی پرواکرے گا۔ تو کیا ہوا کہ وہ سیاہ لکیر ڈال کے بھیجا گیا ہے! بنک کی بارہ منزلہ عمارت کا روشن دان اسکے بغیر نامکمل اور اجڑا ہوا نظر آرہا ہے۔ حالانکہ اندھیرا لاکروں میں باضابطہ طور محفوظ اور روشنی آزاد، بے پروا گھوم رہی ہے۔

''ہائے ہائے............''

''واپس کرو۔ واپس کرو............''

''پوری کرو............''

''زندہ باد............''

لوگوں کا ہجوم۔ بس لوگ ہی لوگ۔ چھوٹی بڑی عمر کے۔ ہر قسم کے۔ جھنڈوں کا سیلاب۔ سیاہ، سرخ، سبز۔ کئی طرح کی نعرہ بازی۔ .... شکر ہے وہ اس ہجوم میں نہیں پھنسا ہے یا پھر جلوس یہاں پہنچنے سے پہلے ہی کہیں اس ہجوم کے پیروں تلے روندا گیا ہو۔ لیکن مجھے کیوں اتنی فکر ہورہی ہے۔ میں کیوں پریشان ہورہا ہوں۔ وہ تو پیدا ہی ہوا ہے سیاہ لکیر کے ساتھ۔

مجھے بس اپنی 'بس' سے غرض ہونی چاہیے۔ وہ ابھی بھی نہیں آئی اور نہ اس ہجوم میں آسکتی ہے۔

''تم تب بھی اسی بس کے انتظار میں تھے اور آج بھی ہو۔''

''تم کون ہو؟''

''تعجب ہے تم مجھے نہیں پہچان پائے۔ بس کے انتظار میں شاید تمہاری آنکھوں کی روشنی بھی کمزور پڑھ گئی ہے۔''

''پہچانوں گا کیوں نہیں۔ تم 'میں' ہو۔''

''ہاں۔ تمہارا ہمزاد۔''

''تم اس جلوس کے ساتھ بھی ہو۔''

''میں اس کے ساتھ نہیں ہوں بلکہ یہ جلوس میرا ہی ہے۔ بس کے انتظار نے سچ میں تمہاری آنکھوں کی روشنی ہی چھین لی ہے۔''

''تم تھک نہیں جاتے ان جلسوں کے ساتھ چلتے چلتے۔''

''اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ چلنا ہے۔ مجبوری ہے۔''

''تم اتنے لاچار کیوں لگ رہے ہو۔''

''تمہارا ہمزاد جو ہوں!''

''میں لاچار نہیں ہوں۔ بس تھوڑا پریشان ہوں۔''

''کیوں؟''

میں نے ہاتھ سے اس بڑی عمارت کے روشن دان کی طرف اشارہ کیا اور اس نے فوراً سمجھ کر جواب دیا۔

''ہاں پتہ ہے۔ وہاں بنک کا وہ لاکر ہے جہاں ساری دنیا کا اندھیرا محفوظ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''روشن دان کے اس شیشے کو ہر روز سیاہ لکیر والا کبوتر چونچ مارنے آتا تھا۔

''تو؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

''آج وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا۔''

''او! تو تم اس وجہ سے پریشان ہو۔ شکر ہے کہ خالی بس کے انتظار میں نہیں ہو۔ اتنا کہہ کے وہ یوں خاموش ہوگیا جیسے بولنے کی قوّت کھو بیٹھا۔ پُر اسرار طریقے سے ہونٹ گھمائے۔ آنکھوں کی پتلیاں نیلم جیسی سخت مگر چمکدار ہوگئیں۔ میرا سر بھی چکرانے لگا۔ اچانک اس کی گردن پر نظر پڑی شاید اس کی گردن پہ بھی سیاہ لکیر تھی۔ وہ مڑ کے دوبارہ اس ہجوم میں گھس کر گم ہوگیا...... اب سمندر میں قطرہ پہچاننا ناممکن تھا۔ روشن دان ابھی بھی خالی تھا۔

بس ابھی بھی نہیں آئی تھی۔

آگے چل کر جلسے میں کچھ بھگدڑ سی مچ گئی۔ کسی نعرے کی ادھوری آواز آئی...... پہلے ایک پتھر چلا، پھر پتھروں کی بوچھاڑ ہوگئی۔ آوازیں آنے لگیں۔ شاید گولی چلی یا پھر بہت سی گولیاں۔ 'شوں' کی آواز ہو کے کچھ چلی۔ شاید پتھر یا پھر گولی اور بنک کی بارہ منزلہ عمارت کے روشن دان پہ جا لگی۔ 'چھن' ہو کے شیشہ تکونی شکل میں ٹوٹ گیا۔

''شکر ہے کہ ابھی بھی سیاہ لکیر والا کبوتر نہیں آیا ہے۔''

اب سڑک ویران ہے، قبرستان جیسی ۔شاید لاٹھی چارج ہوا، شاید کرفیو لگ گیا۔ اچانک سیاہ لکیر والا کبوتر کہیں سے آ کر روشن دان پہ بیٹھ گیا۔ ہمیشہ کی طرح چونچ مارنے لگا اور ٹوٹے شیشے کی نوک سیدھے اسکے گلے میں گھس گئی۔ بہت کوشش کی لیکن شیشے کا ٹکڑا اس کے گلے سے نہ نکلا۔ دھیرے دھیرے اپنے پَر پھیلائے۔ گردن ٹیڑھی ہوگئی۔

روشن دان کا شیشہ ٹوٹ کے بھی اندھیرا باہر نہیں آ رہا تھا۔ شاید خوف کھا بیٹھا۔ عمارت کے باہر بھی روشنی پیلی ہوگئی، جہاں تھی وہیں بت بنکر کھڑی رہی۔

میری بس ابھی بھی نہیں آئی۔

میں ابھی بھی بس کے انتظار میں ہوں۔



پہلا سبق

(رتن لال شانت)

گاؤں میں داخل ہوتے ہی اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈال کر اس نے اپنے پیر روک لیے۔ اپنا بایاں ہاتھ پیٹ تک لے جا کر کھجلانے لگا۔ کمر پسینے سے تر ہو چکی تھی۔ جوتے اور پتلون کو جھاڑنے لگا جو گرد کی تہہ سے اپنی پہچان کھو بیٹھے تھے۔ نہ جانے کتنے گھنٹوں سے انتھک چلا آ رہا تھا۔ اپنی تھکی نظروں سے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ متلاشی نظریں دور تک جا پہنچی اور ایک سڑک ڈھونڈھ نکالی۔۔۔ صبح کی دھند اور گرد و غبار کے کہرے میں سانپ کی کینچلی کی مانند نہ جانے کب سے یوں ہی پڑی تھی۔

پہاڑ کے دامن تلے گھاس کی جھاڑیوں سے، کھائی اور نالوں سے

گزرتے ہوئے، ویران کھیتوں کی دھول مٹی اڑاتے ہوئے صرف اس امید اور ارادے سے آگے بڑھتا گیا کہ وہ اس اجڑے اور پچھڑے ہوئے علاقے کو نئی امید اور نئی روشنی سے جگائے گا۔ وہ خود اس سوچ میں تھا کہ ابھی تک در در بھٹکتا رہا ہوں لیکن اب شاید صحیح مقام نصیب ہوا۔ اسی امید سے آگے بڑھتا رہا۔ دھیرے دھیرے اسکے قدم بھی یہ سوچ کر ہموار ہوتے گئے کہ دوپہر تک پہنچ کر جوئن (join) کرلوں گا اور آج کا دن بھی گنا جائے گا۔

وہ چل ہی رہا تھا کہ دور سے ایک آدمی اسے اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیا۔ نزدیک پہنچ کر اس آدمی نے سلام دعا کی۔ پیار سے ہاتھ پکڑ کر کہا کہ ہم آپ کے ہی انتظار میں تھے۔ اس آدمی کے لمبے لمبے قدموں کے ساتھ وہ بھی اپنی تھکی اور بے جان ٹانگیں گھسیٹنے لگا۔

دونوں گھاس کے چھت والے کچے مکان میں داخل ہوگئے۔ جس کمرے میں یہ داخل ہوئے وہاں جیسے اماوس کا اندھیرا چھایا تھا، جہاں کئی افراد کھڑکی دروازے بند کئے ایک تابوت کے اردگرد بیٹھے تھے۔ وہ بھی بے جھجک اس کمرے میں داخل ہوکر تابوت کے

قریب بیٹھ گیا، جہاں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ نہ کسی نے اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور نہ ہی کسی نے کچھ کہا۔ خاموشی اتنی تھی کہ سانسیں لینے تک کی آوازیں بھی نہیں آتی تھیں۔ اندر معاملہ کیا تھا اسے ابھی بھی خبر نہ تھی لیکن کمرے میں جگہ کم ہونے کی وجہ سے وہ سمٹ کر بیٹھنے لگا اور خود کو سمٹاتے ہوئے اسکا ہاتھ اچانک تابوت پہ جالگا۔ وہ زور سے چیخ پڑا پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہونے لگی۔ معلوم نہیں کب تک۔۔۔

آخر کار اس کا گلا سوکھ گیا اور سر چکرانے لگا تو خاموش ہوگیا۔ آنکھیں ملیں دیکھا کہ کمرے میں اب اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ کھڑا ہوگیا اور باہر نکلا۔ شام اپنا اندھیرا پھیلانے لگا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہیں کوئی نہ تھا جیسے پورا گاؤں اُجڑ چکا تھا۔ نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔ آخر یہ سب کہاں گئے؟ وہ تھوڑی دیر ٹھہرا ،سر جھٹکا جو روتے روتے بھاری ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ گاؤں سے باہر نکلا اور دور سے کسی کی صورت نظر آئی جس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا تھا جب اس صورت نے قریب پہنچ کر صبح کی طرح اس وقت بھی سلام کیا تو اس نے اسے روکا۔ سوچا آج کا دن تو گزر گیا۔ اب کل

سویرے ہی کام پورا ہونا چاہیے اس لئے اسے پوچھنے لگا۔

میاں! یہاں اسکول کہاں پہ ہے؟'' مجھے وہاں جوئن کرنا تھا۔''

''ماسٹر صاحب اب یہاں اسکول کس لئے؟ پہلے پڑھنے والی عمر کا کوئی بچہ وچہ بھی تو ہونا چاہیے نا۔ تقریباً چھے سال ہو گئے جب اُس پہاڑ کا پیر بابا گاؤں کے لوگوں سے خفا ہو گیا...... خود ہی دیکھئے اگر گاؤں میں بارہ سے پندرہ سال کا کوئی لڑکا نظر آئے تو............؟''

یہ کہتے ہوئے وہ کچھ دیر تک زور زور سے قہقہے مارتا رہا............ صبح کا یہ انجان آدمی کتنا عجیب ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر کہنے لگا ''ہاں مگر یہ ہگر صاحب کا بڑپّن ہے کہ چار پانچ سال بعد جب وہ یہاں آتا ہے تو کہتا ہے اسکول دلوا دیگا............ ہونا چاہیے تھا ماسٹر صاحب! لیکن ڈاکٹر! اب حاجی صاحب کے اکلوتے بیٹے کو ہی لیجیے اگر یہاں ڈاکٹر ہوتا تو گاؤں کا یہ اکیلا پڑھنے والا بچہ آج تھوڑے ہی مر جاتا......

آپ ہی ذرا سوچو ماسٹر صاحب............ ماسٹر جی............۔



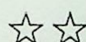
صبح سویرے جب اس کو محسوس ہوا کہ اس کی گردن اکڑ گئی ہے اور ٹانگوں میں بھی چینٹیاں سی رینگ رہی ہیں تو وہ سمجھ گیا کہ اسکی پوری رات وہیں گھاس کے ڈھیر پر گزری ہے۔ جہاں کل وہ آدمی نہ جانے کتنی دیر تک بولتا رہا۔

خوشگوار صبح کی ہوا کے ہلکے سے جھونکوں نے اسے چھوکر تازگی بخشی اور وہ جاگ گیا۔ صبح کی دھیمی روشنی میں اس نے گاؤں کی طرف نظر ڈالی۔ ایک پوری جماعت۔ اسکول۔ مست نیند میں گھاس کی چھت والی جھونپڑیاں، گھاس کے ڈھیر، شالی کے انبار، پیڑ پودے......... وہ کھڑا ہوگیا۔ انگڑائی لی۔ گاؤں کی طرف مڑ کر بلند آواز میں کہنے لگا.........

''آج میں آپ کو یہ سبق پڑھاؤں گا کہ یہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے، انڈے کے مانند۔ سورج ایک ہی جگہ ٹھہرا ہوا ہے اور ہماری زمین اپنے محور اور سورج کے گرد چکر لگاتی ہے، گھومتی ہے۔ آپ خود تجربہ کرو۔ ایک فٹ بال لاؤ۔ اسکو اندھیرے کمرے میں چراغ کی روشنی کے سامنے رکھو۔ اس کا ایک حصہ روشن ہوگا اور دوسرا حصہ تاریک۔ یعنی اندھیرا۔ اسی طرح ہمارے دن رات بنتے ہیں۔

بس اسی طرح موسموں کا تغیر بھی ہوتا ہے۔ سمجھ میں آیا؟ شاباش! اسی طرح آپ کے یہ کھیت، یہ نالے، یہ فصل، پینے کا پانی............۔ اچھا بتاؤ پہاڑوں کے فائدے............؟''

دھوپ اب سیدھے اس کی آنکھوں پر پڑھنے لگی۔ تو ذرا دیر کے لیے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں............ صبح کے کہر آلودہ دھویں میں سڑک صاف نظر آ رہی تھی............ دور............ نیچے............



پے در پے سفر

(شمس الدین شمیم)

سب کچھ تہس نہس ہو کر ہموار ہو چکا تھا۔ اگر چہ روئے زمین پر انڈا ابنا رکاوٹ لڑھک نہ جاتا لیکن نظریں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی تھیں۔ جیسے کہیں کچھ بھی نہیں تھا، صرف ایک بوڑھا آدمی ہموار پتھر پر بیٹھا جسکے سامنے ایک بچّہ اور میں تھا۔ میں دھیرے دھیرے ملبے سے اپنا سارا جسم باہر نکال کر اپنے زخموں کا درد سہلانے لگا۔ اسی بیچ وہ بچّہ بوڑھے آدمی سے پوچھنے لگا۔

''بابا! یہ سب کیا ہوا؟ سارے لوگ کہاں گئے؟ مکان کیوں گر گئے؟ میرے ماں باپ کہاں گئے؟''

بیٹے ! مت پوچھ۔ یہاں اب کوئی نہیں بچا، اگر ہوگا بھی کوئی تو وہ ملبے کے نیچے اپنی جان دے رہا ہوگا۔

''بابا! مجھے اپنے ماں باپ کے پاس جانا ہے۔ وہ کہاں ہوں گے؟''

بوڑھے آدمی نے آہ بھر کے جواب دیا'' بیٹے وہ اب نہیں ملیں گے۔ وہ یہاں سے چلے گئے۔''

بچے کو اس بات پر یقین نہیں ہوا اور پوچھنے لگا'' ارے آپ کیا کہہ رہے ہو!'' وہ کہاں جائیں گے؟ وہ تو یہیں رہتے ہیں۔

یہ سن کر میں اپنا سر دھیرے دھیرے اٹھا کر بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔ بوڑھا ہموار پتھر پر گھٹنے سمیٹ کر بیٹھا ہوا اس معصوم بچے کے سوالوں کا جواب ڈھونڈ رہا تھا۔ اسی دوران بچے نے پھر ایک سوال پوچھا۔

''بابا! آپ جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟ اتنی خاموشی کیوں ہے؟ میرے ماں باپ کہاں گئے؟ ہمیں آج رات شادی میں جانا ہے۔''

''بیٹے کیا آپ کو پتہ ہے جب انسان مر جاتا ہے پھر وہ کہاں

جاتا ہے؟''

''ارے آپ یہ کیسی عجیب باتیں کررہے ہو۔ وہ کیا ہوتا ہے مرجانا؟''

''مرنے کا مطلب ہوتا ہے بیٹا اس دنیا سے چلے جانا ''بوڑھے نے جواب دیا۔

بچہ ہنس پڑا اور پھر کہنے لگا۔ ''بابا! آپ کو شاید نیند آرہی ہے۔ اسی لیے عجیب باتیں کررہے ہو۔''

''سچ کہہ رہا ہوں بیٹے، بنی آدم مرتا ہے تو پھر اسے جلاتے ہیں یا پھر زمین میں دفناتے ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو بابا۔ انسان کو کون جلاتا ہے۔ اسے جلن محسوس نہیں ہوگی کیا؟ اگر زمین میں دفنائیں گے اس کا دم نہیں گھٹے گا کیا؟''

یہ سن کر بوڑھا ہنسنے لگا۔ مجھے بھی ہنسی آئی تھی لیکن پورے جسم میں درد ہونے لگا۔ پسلیاں سکڑ گئیں۔ کیونکہ سب کچھ تہس نہس ہوتے وقت ایک دروازہ میری پیٹھ پر گر پڑا، جس سے میری کمر میں چوٹ آئی۔

خیر۔ بچہ اب بیٹھ کے انگلی سے زمین پہ گول گول دائرے بنا رہا تھا اور اسی بیچ وہ بوڑھے سے پوچھنے لگا۔ ''بابا! اگر انسان مرتا ہوتا تو ہمارے گھر میں بھی کوئی مرا ہوتا۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ اچھا چھوڑو اس بات کو مجھے یہ بتاؤ آپ اس پتھر پہ کب سے بیٹھے ہو۔ آپ کے گھر والے کہاں ہیں؟

بچے کی یہ بات سن کر بوڑھے نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر ایک لمبی آہ بھر لی اور پھر بچے سے کہنے لگا۔

''میرے دو بیٹے تھے۔ ان کو میں نے پالا پوسا۔ پھر بڑے ہو کر وہ مجھے دغا دے گئے۔ مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور میں اس بڑھاپے میں اکیلا رہ گیا۔ اب اسی ہموار پتھر پر بھیک مانگا کرتا ہوں۔

یہ سن کر بچے کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اپنی انگلیاں اپنے کُرتے کے دامن سے صاف کیں اور پھر کچھ سوچنے لگا۔ بوڑھے کو گھور گھور کے دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران میری ٹانگ پر لگی چوٹ میں درد کی شدت بڑھ گئی اور میرے منہ سے زور سے ایک آہ نکل پڑی۔ میری یہ چیخ جیسی آواز سن کر بچہ ڈر گیا اور بوڑھے نے میری

طرف نظریں اٹھائیں اور مجھے بلانے لگا۔

اب جب انہوں نے مجھے دیکھ لیا اس لئے میں رینگتے رینگتے ان تک جا پہنچا۔ ان کے نزدیک پہنچ کر بوڑھا مجھ سے پوچھنے لگا۔

''نوجوان تم کہاں کے ہو؟ بچ کیسے گئے ایسی آفت میں؟''

میں نے اپنے سوکھے ہونٹوں کو جیب سے تر کیا اور پھر اسے کہنے لگا۔

میں آپ کو کیسے کہوں کہ میں کہاں کا ہوں۔ کیونکہ سب کچھ فنا ہو چکا ہے، تہس نہس ہو چکا ہے۔ ہر جگہ ایک جیسی ہوگئی ہے۔ اب کس محلے اور کس شہر کا پتہ دوں۔

میری یہ بات سن کر بوڑھے نے سر ہلا کر اقرار کیا اور بچہ میری طرف ایک امید بھری نگاہ ڈال کر پوچھنے لگا۔

''سنیئے آپ نے میری ماں باپ کو کہیں دیکھا کیا؟''

''بیٹے اس مصیبت میں آپ کے ماں باپ کو کہاں دیکھتا۔ مجھے لگتا ہے وہ کہیں ملبے کے نیچے دب گئے ہوں گے۔''

''آپ بھی بابا کی طرح یہ سب کیا کہہ رہے ہو۔ انسان کہاں مرے گا۔ ہمارے گھر میں تو کوئی نہیں مرا؟''

بچے کی یہ بات سن کر میں کچھ نہ کہہ سکا لیکن بوڑھا کھانس کر بچے سے جواب دینے لگا۔

"بیٹے جو اس دنیا میں آتا ہے اسے واپس بھی جانا پڑتا ہے"
بچے کو یہ سب کہہ کے وہ میری طرف کہنے لگا۔

نوجوان ذرا اس بچے کو سمجھاؤ کہ دنیا کیا ہے؟ یہ سوال جیسے میرے سر پر پہاڑ گر پڑا۔ لیکن بچہ میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ جیسے تیسے میں اسے مختصراً سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔
"دیکھو پیارے بچے دنیا دکھ سکھ اور ہنسنے رونے کا گھر ہے۔"

لیکن بچہ کہنے لگا "ارے آپ یہ کیا کہہ رہے ہو! یہ سب مجھے معلوم ہے۔ میں اپنے گھر میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ہنستا روتا تھا۔"

بچے کی یہ بات سن کر مجھے محسوس ہوا جیسے میرا بچپن لوٹ آیا۔
تھوڑی دیر بعد جب میری ٹانگ میں درد کی شدت اور زیادہ بڑھ گئی تو میری زور سے چیخ نکل پڑی اور بچہ مجھ سے پوچھنے لگا۔
"آپ کیوں چیخ رہے ہو۔ بابا اور میں کیوں نہیں چیختے؟

''مجھے چوٹ آئی ہے اور درد ہو رہا ہے۔ اسلئے چیخ رہا ہوں۔'' میں نے اسے فوراً جواب دیا لیکن وہ پھر پوچھنے لگا۔

''وہ کیا ہوتا ہے درد؟ یہ درد کیسا ہوتا ہے؟'' یہ سن کر میں کوئی جواب نہ دے پایا لیکن بوڑھا میرے بدلے اسے کہنے لگا۔'' بیٹے! ذرا تم اپنی ٹانگ پر چُٹکی بھرو۔'' بچے نے اپنی ٹانگ پر زور سے چُٹکی کاٹی اور اسکے منہ سے ایک چیخ نکل پڑی۔ میں نے آہ بھر لی۔ بوڑھے نے پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر لیا۔ بچے کے چہرے کا رنگ اتر گیا۔ وہ ہکّا بکّا ہو کر بوڑھے سے پوچھنے لگا۔'' درد تو سمجھ میں آیا لیکن دنیا کیا ہوتی ہے؟''

بیٹے جب تم جوان ہو جاؤ گے تو تیری شادی ہوگی، بچے ہوں گے، ان کو پالنے کیلئے تجھے تیز دھوپ میں محنت و مشقت کرنی پڑے گی چوٹیں آئیں گی۔ دوڑتا ہوگا، گرتا ہوگا۔ لیکن جب بوڑھے ہو جاؤ گے تو بچے آپ کو ماریں گے، پیٹیں گے، بیوی کوسے گی، فاقہ لگیں گے۔ پیٹ پالنے کیلئے اچھے برے کام کرنے لگو گے۔ اسی کو دنیا کہتے ہیں۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو سب کچھ خود بخود سمجھ جاؤ گے۔''

بوڑھے کی یہ بات سن کر بچہ ٹھہر گیا اور جھکی نظروں سے میری

طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''پھر مجھے بوڑھا نہیں ہونا۔ پھر میں بچہ ہی ٹھیک ہوں۔''

بچے کی یہ بات سن کر بوڑھا ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ ''بیٹے تیرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ تجھے ایک دن بوڑھا تو ہونا ہی ہے۔ اور دنیا میں رہنے کیلئے ان سب چیزوں کا مقابلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں گی اور درد سہنے ہونگے۔''

یہ سب سن کر بچے کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور میری طرف ترس بھری نگاہ ڈال کر کہنے لگا۔

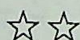
''نہیں۔نہیں۔ میں بوڑھا نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے بچہ ہی رہنا ہے۔ مجھے بچہ ہی رہنا ہے۔'' یہ کہتے کہتے اس نے پریشانی میں اپنی نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں اور دوڑ کر ایک جگہ ملبے کے ڈھیر سے ایک رسّی نکال کر خود کو جلدی جلدی جکڑنے لگا۔ بوڑھا اور میں ایک دوسرے کو حیران ہو کے دیکھنے لگے۔ اسی بیچ بوڑھا ہنس پڑا اور بچے سے کہنے لگا۔

''بیٹے! خود کو رسّی میں جکڑنے سے کچھ نہیں ہوگا۔تم وقت کے ساتھ دھیرے دھیرے خود بڑے ہو جاؤ گے۔''

یہ سن کر بچہ اور جلدی جلدی اپنے آپ کو رسّی میں قید کرتے ہوئے بولنے لگا۔

''نہیں ۔نہیں ۔ مجھے بڑا نہیں ہونا ہے۔میں اس رسّی سے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو کس کے باندھ لوں گا تا کہ میں بچہ ہی رہوں ،ایسا ہی رہوں۔''

بچہ یہی کہتے کہتے خود کو رسّی میں کس کے باندھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن رسّی نیچے سے ڈھیلی ہوتی گئی۔ بوڑھا زور زور سے ہنسنے لگا اور میں اپنی جان دینے لگا۔



ریڈیو اعلان

(انیس ہمدانی)

''ایک چہرہ، جس کی دو آنکھوں کے بجائے ماتھے پر صرف ایک خونین آنکھ۔ زبان باہر نکلی ہوئی جس سے خون کی دھارا بہہ رہی تھی۔''

یہ سن کر میں کھڑا ہو گیا۔ اپنے گھر سے نکل کر اس کے پاس چلا گیا۔ یہ سوچ کر کہ رات گئی کا وقت ہے پہلے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکایا۔ اس نے بھی جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا۔۔تم اتنے گھبرائے کیوں ہو! وہ بھی اتنی دیر گئے۔ سب کچھ ٹھیک تو ہے نا۔''

''تم نہیں جانتے کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا نہیں جانتا؟'' اس نے کہا۔

کہتے ہیں اس کے آنے کا وقت ہوگیا جسکی دو آنکھوں کے بجائے ماتھے پر صرف ایک خونین آنکھ ہوگی۔ زبان باہر نکلی ہوگی جس سے خون بہہ رہا ہوگا۔

"تجھے کس نے کہا؟" وہ مجھے بڑی حیرانی سے پوچھنے لگا۔

"ریڈیو پر اعلان کیا گیا۔"

"اچھا" وہ بالکل بھی نہیں چونکا۔

"تم نے نہیں سنا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"سنا ہوتا تو تجھ سے کیوں پوچھتا۔ مجھے اس اعلان کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں۔ تو نے یہ اعلان خود سنا کیا؟" وہ پوچھنے لگا۔

ہاں۔ میں نے ابھی سنا۔ سنتے ہی آپ کے پاس دوڑا چلا آیا۔ اس سے پہلے بھی کبھی یہ اعلان ہوا تھا اسکی مجھے خبر نہیں لیکن میرے خیال میں پہلی بار ہوا ہے کیونکہ میں نے ابھی سنا ہے۔

"نہیں یہ تمہاری غلط فہمی ہوگی۔ اصل وقت وہ ہے جب اس کا اعلان پہلی بار ہوا تھا نہ کہ وہ جب آپ نے سنا۔ یہ غلطی اسکی نہیں جس نے اعلان کیا بلکہ تمہاری ہے۔ کیونکہ تم یہ اعلان پہلے ہی نہیں سن

پائے۔'' اس نے مجھے قائل کرتے ہوئے کہا۔ اس لیے میں کچھ کہہ نہ پایا۔ وہ پھر مجھ سے کہنے لگا۔

''خاموش کیوں ہو گئے؟ یہ خاموش رہنے کا وقت نہیں۔ کہو اعلان میں اور کیا کیا کہا گیا؟''

''کہا گیا کہ لوگ اپنے گھروں سے بالکل بھی باہر نہ نکلیں۔ کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے رکھیں۔''

''اسکے بعد کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ دیکھنے کیلئے کہ لوگ کیا کر رہے ہیں میں گھر سے باہر آ گیا۔''

''تو کیا دیکھا؟'' وہ پوچھتا گیا۔

''کچھ بھی بدلا نہیں تھا۔ سبھی اپنے اپنے کام میں روز مرہ کی طرح مصروف تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، نہ کسی نے کچھ کہا تھا اور نہ ہی کسی نے کچھ سنا تھا۔''

''لوگ گھروں سے باہر نکلے تھے کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر کیا کیا؟''

''میں واپس اپنے گھر میں داخل ہوا۔ سوچا کہیں میں نے کچھ غلط تو نہیں سنا، اس لیے میں نے ریڈیو پھر سے آن کیا۔ اعلان ابھی بھی چل رہا تھا''۔ ''لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ دروازے اور کھڑکیاں بند ہی رکھیں۔'' اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میں نے کچھ غلط نہیں سنا تھا۔ میں نے بھی وہی کیا لیکن اب میں آپکے پاس آ گیا۔'' یہ سب میں وضاحت سے کہنے لگا تاکہ وہ پورا معاملہ سمجھ سکے۔ پھر وہ کہنے لگا۔

'' ارے تو اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت۔ چلو اندر آ جاؤ۔ دروازے پہ کھڑے کیوں ہو۔'' وہ آگے آگے کمرے میں داخل ہوا اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔ میں کھڑکی کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ بھی میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگا۔ ''کھول دو کھڑکی تم دیکھو گے کہ ابھی بھی کچھ نہیں بدلا۔''

''نہیں ایسا بالکل بھی نہیں کرنا۔ اعلان میں کہا گیا ہے کھڑکیاں بند رکھی جائیں۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے جب تم نہیں چاہتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ پھر بجلی ہی بند کر دو کیونکہ بہت دیر ہو گئی ہے............''

شاید اسکے سونے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں اسکی یہ بات سن کر گھبرا سا گیا۔اس لیے میں نے انکار کیا۔

''کیوں؟ اس نے پوچھا۔''

''میں اندھیرے سے ڈرتا ہوں۔'' ویسے بھی میں اس بات پر کیسے یقین کروں کہ اب صبح ہو گی۔''

میری بات سن کر وہ یوں ہنس پڑا جیسے میں جھوٹ کہہ رہا تھا۔ پھر کہنے لگا''کیسی بات کرتے ہو۔ یہ بھی پوچھنے والی بات ہے کیا''

''میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔کل کیا ہو گا نہ تم جانتے ہو اور نہ ہی سوچ سکتے ہو۔'' میں نے اسے کہا۔

''اب مجھے ہی معلوم نہیں۔ کھڑکی بھی کھولنے نہیں دی۔ صبح کا انتظار کرنے کو بھی تیار نہیں ہو۔ اندھیرے سے بھی ڈرتے ہو۔ پھر اگر میں تجھے ایک بات کہوں تو کیا تجھے یقین آئے گا۔'' اس نے کہا۔

''یقین کیوں نہیں آئے گا۔ کہو تو سہی''

''تاریکی اور روشنی صرف محسوس کرنے پر منحصر ہے۔'' وہ کہتا گیا اور میں بُت بن کر اسے دیکھتا رہا اور جب میں نے اسے واپس کچھ بھی نہیں کہا تو وہ ایک عجب لہجے میں کہنے لگا۔

''کیا تم مجھ سے ڈرتے ہو؟''

''تم سے کیوں ڈروں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اور اگر میں کہوں کہ وہ میں ہی ہوں تو پھر مجھ سے ڈرو گے کیا۔''

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جس کے بارے میں ریڈیو اعلان ہوا'' اس نے کہا۔

''وہ کیسے ممکن ہے۔''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔'' وہ میں ہی ہوں لیکن اس کے ذمّہ دار وہی لوگ ہیں......'' کہتے کہتے اسکی دو آنکھیں ایک دوسرے کے نزدیک آگئیں۔ ناک غائب ہونے لگی۔ ماتھے پر صرف ایک خونین آنکھ نمودار ہوئی۔ اسکی زبان دھیرے دھیرے باہر آنے لگی اور میں جھٹ سے مڑکر واپس گھر کی طرف دوڑنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے اسکی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔

''بیوقوف روشنی اور تاریکی محسوس کرنے پر منحصر ہے۔''

باہر لوگ اپنے گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کرنے لگے تھے۔

☆☆

رنگ راول

(مدثر رشید)

اس سے پہلے کہ میں اسے انکار کرتا اس نے اپنی داہنی مٹھی میں کوئی پوشیدہ چیز میری طرف بڑھائی۔ میں حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔سوچ رہا تھا کہ میں ہر روز اپنے رب سے صبح سویرے مسجد جاکر کچھ مانگتا رہتا تھا، لیکن آج کوئی عجب ہی معاملہ درپیش ہے۔

اب کیا کروں۔۔؟ لوں کہ نالوں۔۔؟

ابھی یہ سوال دل و دماغ کے بیچ کھینچا تانی میں ہی تھا کہ ہاتھوں نے اپنا فیصلہ صادر کیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی کانپتے کانپتے

اس کی طرف بڑھنے لگے۔ جونہی اس پوشیدہ چیز کو ہاتھ نے چھوا تو اچانک گاؤں میں کوئی تیز دھار چیخ سنائی دی۔

''ارے! یہ کیسی آواز تھی؟'' میرا ساتھی میرے ہاتھوں میں کچھ تھما کر کہنے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی سوچ کا گھوڑا دوڑا کر اس کے سوال کا کوئی جواب دیتا گاؤں سے یکے بعد دیگرے کئی چیخیں اور شور شرابا سنائی دینے لگا۔ ہمارے ذہن کوئی جواب ڈھونڈنے کے بجائے خوف زدہ ہونے لگے۔ ایک طرف شور اور دوسری طرف ہمارا ڈر بڑھتا گیا۔ پھر بھی ہم دونوں ہمت کر کے گاؤں کی طرف دوڑنے لگے۔

گاؤں پہنچ کر ہم نے ایک عجیب سی کیفیت دیکھی۔ لوگ ڈر کے مارے ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے جیسے کوئی ناگہانی آفت آئی ہو۔ ایسی صورت حال دیکھ کر ہم اور زیادہ خوف کھا گئے۔ میری دھڑکن بڑھنے لگی اور سانسیں جو دوڑتے دوڑتے پہلے ہی پھول چکی تھیں اور زیادہ پھولنے لگیں۔ لیکن ابھی ہم یہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ ماجرہ کیا ہے؟ یہ بھگدڑ کیوں مچی ہے؟ اس لئے ہم نے لوگوں سے پوچھنے کی

کوشش کی جو لاٹھیاں اور پتھر ہاتھوں میں لئے مسجد کی طرف دوڑ رہے تھے۔ لیکن ان دوڑتے بھاگتے لوگوں نے جب ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی تو میرے ساتھی نے ایک آدمی کو جبراً روک کر پوچھا۔ ''یہاں کیا ہوا ہے؟ لوگ کیوں دوڑ رہے ہیں؟ کیا کوئی آفت آئی ہے؟''۔

''گاؤں میں ''رنگ راول'' گھس گیا ہے'' اس نے سہمی اور تھرتھراتی آواز میں جواب دیا۔ ''اسی لیے لوگ پریشان ہیں''

''رنگ راول'' میں یہ نام سُن کر حیران ہو گیا۔ کیونکہ یہ نام میں نے پہلی بار سُنا تھا۔ مگر نام سن کر میں اپنے وجود کے دائرے سے باہر کسی خلا میں پہنچ گیا۔ جیسے اس نام کو میری ذات سے کوئی گہری نسبت تھی، کوئی گہرا رشتہ تھا۔ اس سوچ کے دائرے سے باہر نکل کر میں نے اس سے پوچھا۔ یہ ''رنگ راول'' کیا ہے اور کون ہے؟''
اس نے انجان طریقے سے بتایا کہ ''وہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں لیکن سنا ہے کوئی بُری بھلا ہے جسکی جسامت اور قدامت پست ہے مگر خصائل وحشیانہ۔

''کہاں پر ہے وہ؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''وہ مسجد کے سامنے گھنے پتّوں والے پیڑ میں چھپا ہے۔''
اس نے ہاتھ سے اشارہ دکھا کر کہا۔ ''جسے لوگ مارنے کی کوشش میں لگے ہیں۔''

''چلو ہم بھی چل کر اسے دیکھتے ہیں..........'' میرے ساتھی نے کہا۔

مسجد کے قریب پہنچ کر ہم بھی اس بھیڑ بھاڑ میں گھُس گئے جنہوں نے گھنے پتّوں والے پیڑ کی طرف پتھروں کی بارش کی تھی۔ ہم بھی نظروں سے 'رنگ راول' کو ڈھونڈنے لگے کہ اچانک مجھے سبز سر اور سفید جسم والی کسی صورت پر نظر پڑی جو کبوتر سے تھوڑا بڑا اور مرغے سے ذرا چھوٹا تھا۔ حسن و جمال اتنا کہ دل نے چاہا اسے گود میں اٹھالوں اور سینے میں گھر کرلوں۔ لیکن میں اس وقت حیرت زدہ ہوا اور میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی جب سنا کہ یہی رنگ راول ہے جسے لوگ از جان کرنے کے کوشاں ہیں۔ میرا پورا بدن پیلا پڑ گیا۔ اسے بغور دیکھ کر سوچنے لگا کہ اتنا خوبصورت پرندہ اس آدم ہجوم کو کون سا نقصان پہنچائے گا۔ بلکہ ایسا پرندہ پالنے سے تو ان کی اپنی شان بڑھ جاتی۔ شاید اس ہجوم کی آنکھوں پر کالی پٹی بندھی ہے۔

اس لیے یہ خوبصورت پرندہ ان کو وحشی دکھائی دے رہا ہے۔

اس سوچ سے جگا کر میرے ساتھی نے مجھ سے کہا۔ ''تم کن خیالوں میں ڈوب گئے۔ لو اٹھا لو یہ پتھر اور مار و اسے، شاید تمہارا نشانہ ہی صحیح لگ جائے۔'' میرا دل و دماغ ایک بار پھر آپس میں لڑنے لگا۔ میرے ظاہر اور باطن میں تضاد شروع ہونے لگا کہ ''ماروں یا نہ ماروں''۔ الغرض بے غرضی سے پتھر اٹھا کر اس مجبوری میں اسے مارنے لگا کہ ایسا نا کروں تو یہ ہجوم مجھے اپنی برادری سے خارج کر دے گا۔ اسی لیے پتھر اٹھا کر جونہی اسے مارنے لگا کہ اچانک اس کی خوبصورت آنکھوں پر نظر پڑی اور میں جیسے بے جان بُت بن کر رہ گیا اور وہ جیسے بولنے لگا کہ آؤ میری آنکھوں میں جھانک کے پڑھ لو میں یہاں کیوں آیا؟ کیسے پہونچا؟ اس کی آنکھیں جیسے اپنا حال خود بیان کرنے لگیں:

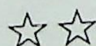
''میں سات جہاں پرواز کر کے آپ کی خاطر اس دنیا میں آیا تھا لیکن شاید یہاں پہنچتے پہنچتے مجھے اتنی دیر ہوگئی کہ آپ بھی اس آدم ہجوم کا حصہ بن گئے۔ ہر روز میری ضرورت محسوس کر کے مجھے رب سے مانگا کرتے تھے اور آج جب میں آپ کے پاس پہنچ گیا

تھا تو مجھے اپنے ہی ہاتھوں سے مارنا چاہتے ہو۔ افسوس اے آدم زاد افسوس!!‘‘

اتنا ہی پڑھ کر اس کی آنکھوں کے پردے بند ہو گئے اور مجھ پہ بے ہوشی طاری ہو گئی۔

جب ہوش آیا تو میں نے خود کو لوگوں کے ہاتھوں میں پڑا ہوا پایا میں نے پوچھا ’’رنگ راول کہاں ہے؟‘‘

انہوں نے کہا ’’آپ کے ہاتھ سے نکلا پتھر سیدھے اس کے سینے پر جا لگا اور وہ پیڑ سے گرا، لیکن گرتے گرتے ہی وہ کہیں غائب ہو گیا اور آپ بے ہوش ہو کر جھٹ سے زمین پر گر پڑے۔



اس لیے یہ خوبصورت پرندہ ان کو وحشی دکھائی دے رہا ہے۔

اس سوچ سے جگا کر میرے ساتھی نے مجھ سے کہا۔ ''تم کن خیالوں میں ڈوب گئے۔ لو اٹھالو یہ پتھر اور مار و اسے، شاید تمہارا نشانہ ہی صحیح لگ جائے۔'' میرا دل و دماغ ایک بار پھر آپس میں لڑنے لگا۔ میرے ظاہر اور باطن میں تضاد شروع ہونے لگا کہ ''ماروں یا نہ ماروں''۔ الغرض بے غرضی سے پتھر اٹھا کر اس مجبوری میں اسے مارنے لگا کہ ایسا نا کروں تو یہ ہجوم مجھے اپنی برادری سے خارج کر دے گا۔ اسی لیے پتھر اٹھا کر جونہی اسے مارنے لگا کہ اچانک اس کی خوبصورت آنکھوں پر نظر پڑی اور میں جیسے بے جان بُت بن کر رہ گیا اور وہ جیسے بولنے لگا کہ آؤ میری آنکھوں میں جھانک کے پڑھ لو میں یہاں کیوں آیا؟ کیسے پہونچا؟ اس کی آنکھیں جیسے اپنا حال خود بیان کرنے لگیں:

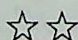
''میں سات جہاں پرواز کر کے آپ کی خاطر اس دنیا میں آیا تھا لیکن شاید یہاں پہنچتے پہنچتے مجھے اتنی دیر ہو گئی کہ آپ بھی اس آدم ہجوم کا حصہ بن گئے۔ ہر روز میری ضرورت محسوس کر کے مجھے رب سے مانگا کرتے تھے اور آج جب میں آپ کے پاس پہنچ گیا

تھا تو مجھے اپنے ہی ہاتھوں سے مارنا چاہتے ہو۔ افسوس اے آدم زاد افسوس !!''

اتنا ہی پڑھ کر اس کی آنکھوں کے پردے بند ہو گئے اور مجھ پہ بے ہوشی طاری ہو گئی۔

جب ہوش آیا تو میں نے خود کو لوگوں کے ہاتھوں میں پڑا ہوا پایا میں نے پوچھا ''رنگ راول کہاں ہے؟''

انہوں نے کہا '' آپ کے ہاتھ سے نکلا پتھر سیدھے اس کے سینے پر جا لگا اور وہ پیڑ سے گرا، لیکن گرتے گرتے ہی وہ کہیں غائب ہو گیا اور آپ بے ہوش ہو کر جھٹ سے زمین پر گر پڑے۔



وسیلے: جو کبھی کم نہ ہوں گے

'وسیلے'، جن کی ضرورت انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر پڑتی ہے۔ پیدا ہونے سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک وسیلوں سے ہی انسان فاصلے طے کرتا ہے اور شاید مرنے کے بعد بھی۔ لیکن وسیلوں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ اپنے مقدور کے مطابق ہر انسان کو میسّر ہوتے ہیں۔ انسان کے ہر چھوٹے کام سے لے کر کسی بڑے پروجیکٹ تک وسیلے ہی درکار ہوتے ہیں۔ سردی دور کرنے کے لیے گرمی یا دھوپ کا وسیلہ، گرمی کم کرنے کے لیے چھاؤں کا وسیلہ، بھوک مٹانے کے لیے کھانے کا وسیلہ، پیاس بجھانے کے لیے پانی کا وسیلہ، بدن ڈھکنے کے لیے کپڑوں کا وسیلہ، پڑھنے کے لیے کتابوں کا وسیلہ، سفر کے لیے گاڑیوں کا وسیلہ۔ غرض زندگی کی بھاگ دوڑ میں سوئی

سے لے کر بڑے سے بڑے کارخانے کا وسیلہ۔ یہ وسیلے صرف خارجی ہی نہیں بلکہ داخلی سطح پر بھی درکار ہوتے ہیں۔ سوچنے کے لیے ذہن کا وسیلہ، ہمّت کے لیے دل کا وسیلہ۔ یہاں تک کہ جنّت اور جہنم کے لیے اچھے اور برے اعمال کا وسیلہ۔ میں بھی ان ہی وسیلوں کے سہارے آگے بڑھتا رہا اور زندگی کے چھوٹے بڑے کام انجام دیتا رہا۔ ان ہی وسیلوں کے عوض بھی یہ کتاب قارئین تک پہنچ گئی۔

اس کتاب کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجھے کئی چھوٹے بڑے وسیلوں کا سہارا لینا پڑا۔ ہوا یوں کہ ایم۔ اے۔ کشمیری سے لے کر ایم۔ فل۔ کشمیری کی ڈگری حاصل کرنے تک میں نے کئی عمدہ کشمیری افسانے پڑھے۔ اس کے بعد ایم۔ اے۔ اردو کیا تو اس دوران بھی اردو کے اعلیٰ افسانے پڑھنے کا موقعہ ملا۔ دونوں زبانوں کے ادب کو پڑھ کے سوچنے لگا کہ اردو ادب کو تو ہر کوئی کشمیری زبان دان پڑھ سکتا ہے، کاش کشمیری ادب کو بھی وادی سے باہر کے اردو ناقدین اور قارئین پڑھ پاتے تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ ایم۔ اے۔ اردو کے بعد ریاست سے باہر جا کر پی ایچ۔ ڈی۔ اردو کرنے کا موقع ملا تو ذہن کے وسیلے سے پلتا ہوا نیم خام خیال بھی پختہ ہونے لگا

وسیلے: جو کبھی کم نہ ہوں گے

'وسیلے، جن کی ضرورت انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر پڑتی ہے۔ پیدا ہونے سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک وسیلوں سے ہی انسان فاصلے طے کرتا ہے اور شاید مرنے کے بعد بھی۔ لیکن وسیلوں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ اپنے مقدور کے مطابق ہر انسان کو میسّر ہوتے ہیں۔ انسان کے ہر چھوٹے کام سے لے کر کسی بڑے پروجیکٹ تک وسیلے ہی درکار ہوتے ہیں۔ سردی دور کرنے کے لیے گرمی یا دھوپ کا وسیلہ، گرمی کم کرنے کے لیے چھاؤں کا وسیلہ، بھوک مٹانے کے لیے کھانے کا وسیلہ، پیاس بجھانے کے لیے پانی کا وسیلہ، بدن ڈھکنے کے لیے کپڑوں کا وسیلہ، پڑھنے کے لیے کتابوں کا وسیلہ، سفر کے لیے گاڑیوں کا وسیلہ۔ غرض زندگی کی بھاگ دوڑ میں سوئی

سے لے کر بڑے سے بڑے کارخانے کا وسیلہ۔ یہ وسیلے صرف خارجی ہی نہیں بلکہ داخلی سطح پر بھی درکار ہوتے ہیں۔سوچنے کے لیے ذہن کا وسیلہ، ہمّت کے لیے دل کا وسیلہ۔ یہاں تک کہ جنّت اور جہنم کے لیے اچھے اور برے اعمال کا وسیلہ۔ میں بھی ان ہی وسیلوں کے سہارے آگے بڑھتا رہا اور زندگی کے چھوٹے بڑے کام انجام دیتا رہا۔ ان ہی وسیلوں کے عوض بھی یہ کتاب قارئین تک پہنچ گئی۔

اس کتاب کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجھے کئی چھوٹے بڑے وسیلوں کا سہارا لینا پڑا۔ ہوا یوں کہ ایم۔اے۔کشمیری سے لے کر ایم۔فل۔کشمیری کی ڈگری حاصل کرنے تک میں نے کئی عمدہ کشمیری افسانے پڑھے۔اس کے بعد ایم۔اے۔اردو کیا تو اس دوران بھی اردو کے اعلیٰ افسانے پڑھنے کا موقعہ ملا۔ دونوں زبانوں کے ادب کو پڑھ کے سوچنے لگا کہ اردو ادب کو تو ہر کوئی کشمیری زبان دان پڑھ سکتا ہے، کاش کشمیری ادب کو بھی وادی سے باہر کے اردو ناقدین اور قارئین پڑھ پاتے تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ ایم۔اے۔ اردو کے بعد ریاست سے باہر جا کر پی ایچ۔ڈی۔اردو کرنے کا موقع ملا تو ذہن کے وسیلے سے پلتا ہوا نیم خام خیال بھی پختہ ہونے لگا

کہ کیوں نہ کشمیری افسانوں کو اردو میں ترجمہ کر کے اردو قارئین تک پہنچایا جائے۔ ذہن میں تو خیال پختہ ہو گیا لیکن اس کام کے لیے ہمّت جٹا پانا مشکل ہو رہا تھا تو دل کو وسیلہ بنانا پڑا۔ دل نے ہمّت بخشی تو چند اچھے کشمیری افسانوی مجموعوں کے وسیلے سے کچھ مخصوص افسانے چن لیے اور ذہن اور قلب و قلم کی کاوش سے لفظوں کے سہارے ان افسانوں کے تراجم اردو میں کرنے لگا۔

ترجمے کے کام میں کئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مترجم لفظوں کے لغوی معنی تو بہ آسانی ترجمہ کرسکتا ہے لیکن ہر زبان میں علاقائی الفاظ، ترکیبیں، محاورے اور لفظوں کے اصطلاحی معنی وغیرہ ایسے جز ہوتے ہیں جن کے یا تو دوسری زبان میں متبادل موجود نہیں ہوتے یا پھر ان کے لفظوں اور جملوں میں بسے احساسات اور جذبات کو ہم ہو بہو ترجمہ نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں ترجمے کا کام جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ خیر ترجمہ کرتے وقت مجھے بھی ایسی ہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اس لیے مشکل الفاظ کے معنی جاننے کے لیے ڈکشنریوں کو وسیلہ بنانا پڑا اور جہاں ڈکشنریوں نے بھی ہاتھ کھڑے کیے وہاں میں نے اپنے والدِ محترم رشید فیروز اور کئی

دوستوں کے علاوہ چند ذی شعور لوگوں کا سہارا لیا جن میں محترم دیپک بدکی، ڈاکٹر روبینہ شبنم، روحی سلطان اور محترم اطہر ریاض وغیرہ شامل ہیں۔

اک 'وقت' تھا جسے کئی حصّوں میں بانٹنا پڑا۔ کچھ اپنے لیے، کچھ گھر والوں اور دوستوں کے لیے اور کچھ لکھنے پڑھنے کے لیے درکار تھا۔ دوسری طرف پی ایچ۔ڈی۔ کا کام بھی دردست تھا۔ ان سارے کاموں کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا وقت اس ترجمے کے کام پر بھی صرف کرنے لگا۔ وقت کی کمی سے چند ہی افسانے چن کے انھیں کتابی صورت دینے کی سوچی جس کے لیے ایک بار پھر دل سے تھوڑی ہمّت لے کر اشاعتی بازار کا رخ کیا اور افسانوں کو ترتیب دے کر ایک کتابی سانچے میں ڈھالنے کے لیے اپنے ایک دوست عرفان بشیر کو وسیلہ بنانا پڑا جس نے اس کتاب کے مضامین کو ٹائپ کیا۔ ٹائپ کرنے کے بعد پروف ریڈنگ کا مسئلہ تھا تو وسیلہ عموماً اپنے ذہن اور خصوصاً اپنے دوست شوکت احمد ملک کو بنالیا۔ پھر بھی ادنیٰ دماغوں سے کئی غلطیاں چھوٹیں اس لیے مضامین کی مزید خامیاں دور کرنے کے لیے عصرِ حاضر کے مشہور اردو افسانہ نگار محترم دیپک

بد کی کو وسیلہ بنانا پڑا جنھوں نے مضامین کی غلطیوں اور خامیوں کی نشاندہی کے علاوہ کتاب کا 'پیش لفظ' بھی تحریر کیا جس کے لیے میں تہہ دل سے ان کا مشکور ہوں۔ لیکن وسیلوں کا سلسلہ یہیں نہیں تھا۔ کتاب کی پوری جانچ اور مزید خامیوں کا ازالہ کرنے کے لیے میں نے ایسے دو وسیلوں کا سہارا لیا جن کے طفیل میں ہاتھ میں قلم تھامنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ وسیلے ہیں میرے موجودہ پی ایچ۔ ڈی۔ اردو کے نگران اور صدر شعبۂ اردو پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ جناب پروفیسر محمد جمیل جنھوں نے کتاب کا 'استقبالیہ' بھی لکھا اور وادی کے مایا ناز ادیب، اداکار اور براڈ کاسٹر محترم زاہد مختار صاحب جنھوں نے کتاب کا 'سرنامہ' بھی تحریر کیا۔ ان دونوں کا میں تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں۔ اس کے بعد کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے لیے پبلشر کو وسیلہ بنانا پڑا جس کی وساطت سے یہ کتاب قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ گئی اور اب قارئین اور ناقدین کے وسیلے سے حوصلہ افزائی کی اجرت درکار ہے۔

محمد رشید فیروز

pai dar pai safar

Story Collection

Translator

Mudassir Rashid

.... مدثر رشید نے کشمیری افسانے کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق جانکاری دی ہے اور مختلف ادوار کے نمایاں افسانہ نگاروں کی اہم تصانیف کا ذکر بھی کیا ہے ۔ ان افسانوں کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مرتب کو جدیدیت نے خاصا متاثر کیا ہے...... دیپک بُدکی

.... شکر قلم بخشنے والے خالقِ قلم کا کہ اس کتاب میں مدثر رشید فن کی نہایت ہی تنگ ، دشوار گذار راہوں سے گزرتے ہوئے مشقت طلب لمحات کی کیفیات سے سرخروئی کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہوئے ایک اچھے ترجمے سے لبریز کچھ کشمیری کہانیوں کے خوشبو دار احساس کے ساتھ قاری اور ناقد کے روبرو آئے ہیں......زاہد مختار

ISBN: 978-93-5346-835-4



